جلد ۹۴   جنوری ۱۹۸۱ء   عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جنوری ۱۹۸۱ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۱ھ	جلد ۹۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ ۳۰/- روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی پرنٹر پبلشر نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسانی تاریخ ترکِ وطن کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بڑے بڑے انسانی گروہوں کو صدیوں کے قومی مسکن چھوڑنے پڑے ہیں۔ خصوصاً جنگِ عظیم دوم کے بعد کے قریبی زمانے میں تو آبادیوں کے اِدھر سے اُدھر منتقل ہونے یا برسوں کیمپوں میں رہنے کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ موجودہ تہذیب پر سے یکسر اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ جمہوریت، رواداری اور مساوات اور حقِ اختلاف اور حقِ خود ارادیت کے حق میں سنہرے فلسفوں کا تانا بانا تاریخ کے آسمان پر قوسِ قزح کی طرح دکھائی دیتا ہے اور آدمی مسحور ہو کر پکار اُٹھتا ہے کہ یہ عظیم دَورِ ترقی ہے اور انسان ذہنی اور سماجی لحاظ سے بہت بلند ہو چکا ہے، مگر اس دَورِ تہذیب کی اصطلاحات اور سلوگنوں کے سکے تجربے کی کسوٹی پر یکسر کھوٹے نکلتے ہیں۔ ہر جھوٹ پر سچائی کا لیبل لگا دیا گیا ہے اور ہر بُرائی کی پیکنگ ترقی کے اطلسی پارچات سے کی گئی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہم دروغ پر دروغ کے طلسم خانے میں جی رہے ہیں۔

جس درجے اور جن جن طریقوں سے انسان پر اس دَور میں تشدد ہو رہا ہے، جو پُر فریب چالیں ہر بڑی قوم چھوٹی قوموں کے خلاف چل رہی ہے، یا بہت سے علاقوں میں وحشی اکثریتیں جس طرح اقلیتوں کو چیر پھاڑ رہی ہیں، اور خاص طور سے مسلمانوں کے خلاف گہری سازشوں اور مصنوعی پروپیگنڈے کی شکل میں مختلف اطراف سے جو صلیبی جنگ لڑی جا رہی ہے، ان حقائق کو سمجھنے کے بعد انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ سرے سے آج کی تہذیب قرونِ مظلمہ کی وحشت کا نیا روپ تو نہیں اور قوت کی اعلیٰ مسندوں پر بیٹھنے والے اکابر انسانوں کے روپ میں درندے تو نہیں۔

وہ درندگی جس نے ویت نام کے لاکھوں انسانوں کو دیس سے اکھاڑ دیا۔ جس نے کمپوچیا کی آبادی کو ہلا دیا، جس نے صومالیہ کی سرحد پر لاکھوں انسانوں کو بچوں سمیت پانی تک کے لیے سسکنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ درندگی جو آسام سے لاکھوں مسلمانوں کو نکالنے کے لیے طوفان اُٹھائے ہوئے ہے اور کل جس نے بنگلہ دیش سے ہزارہا افراد کو برما، نیپال اور دوسرے اطراف میں پناہ ڈھونڈنے کے لیے پریشان حال بنا دیا، انسانیت کی پستی کی کیسی بڑی مثالیں ہیں۔

تازہ مثال افغانستان کے مہاجرین کی ہے جو تقریباً ۱۵، ۱۶ لاکھ کی تعداد میں گھروں سے اُجڑ کر ملک سے باہر آ گئے ہیں۔[۱]

اسلامی مقاصد کے لیے جان بازی کرنے والی قوم کے ایسے لوگ جو زخمی ہو گئے یا جن کے گھر بلکہ گاؤں کے گاؤں اُجاڑ دیے گئے ہیں، یا جن عورتوں اور بچوں کے سرپرست ختم ہو گئے ہیں، یا جن لوگوں کو خواتین کی عزت خطرے میں دیکھ کر وطن چھوڑنا پڑا ہے، اُن کی مجبورانہ ہجرت ایک دینی عمل ہے اور اس وجہ سے ان کا آنا ہمارے لیے بھی باعثِ خیر و برکت ہے۔ اُن کو اپنے ہاں پناہ دینا باعثِ ثواب ہے۔

دوسری طرف ۱۳ لاکھ مہاجرین کا ہمارے ہاں طویل عرصے کے لیے میہمان بن کے رہنا ایک امتحان و آزمائش ہے۔ ہمارے اسلامی جذبۂ اخوت کے لیے خدا نے ہمیں ان کا انصار بنایا ہے تو اس کے ہاں حساب بھی ہونا ہے کہ ہم نے انصار ہونے کا حق کس حد تک ادا کیا۔

---

[۱] اصطلاحاً ہر وہ ترکِ وطن ہجرت کہلاتا ہے جو خدا اور اس کے دین کے لیے ہو، دیگر اسباب سے تبدیلِ وطن کو ہجرت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ خدا اور دین کی محبت کے بجائے کسی مفاد کے لیے نکلنے والوں کو تارکینِ وطن اور کسی مصیبت یا ظلم و جور کی وجہ سے گھر بار چھوڑنے والوں کو پناہ گزین کہا جاتا ہے۔ افغانستان کے لوگ ایک مخالفِ اسلام نظریے کے تسلط کے خلاف جہاد آرا ہیں اور اس معرکہ آرائی کی وجہ سے وہ جب ناقابلِ حل آلام و مصائب سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ سرحد پار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اُن کا وطن چھوڑنا ہجرت کی تعریف میں آتا ہے۔

اس امتحان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تاریخِ انسانی کی وہ عظیم و روشن مثال سامنے لائیے جب کہ مدینے کے مسلمانوں پر سینکڑوں مہاجرین کو سنبھالنے کی ذمہ داری آ پڑی تھی اور اس ذمہ داری کو انہوں نے اس فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے ادا کیا کہ اپنے اموال و املاک میں سے نصف نصف اُن کے حوالے کر دیا۔ ہم مسلمان ہیں تو اس قسم کا موقع جب بھی تاریخ میں پیدا ہو، ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم مدینے کی روشن مثال کا احیا کر کے دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت اور رشتۂ اخوتِ اسلامی کے تقدس کو تاباں کر دکھائیں۔

اہل پاکستان میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جسے ۱۹۴۷ء میں بھارت سے خون کے سمندر عبور کر کے پاکستان میں پناہ لینی پڑی تھی، ایک تعداد ایسی بھی ہے جو ۱۹۷۱ء کے سانحہ کے بعد بنگلہ دیش سے نکل کر پہلے دوسرے علاقوں میں اور پھر پاکستان میں پہنچی، اور اب بھی بہاریوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کے اندر سیلابوں کی تباہ کاریوں کا نشانہ بن کر سرکاری اور عوامی امدادی کارروائیوں پہ مہینوں کیمپوں میں گذر کرنے والے بھی مہاجرین کے مسائل کو سمجھ سکتے ہیں۔

جو لوگ اس آزمائش سے گذر چکے ہیں، اُن کو اندازہ ہوگا کہ لُٹ پِٹ کر وطن سے نکلنا کیا کیا مسائل اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اُس وقت قدم قدم پہ ہر شخص دوسرے انسانوں کی محبت و حمایت اور اُن کے احسان و تعاون کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ پھر دو چار دس دن کہیں رہنا ہو تو محض برائے نام غذا پہ لوگ جنگلوں اور غاروں میں بھی وقت گذار لیتے ہیں۔ لیکن جب لمبے عرصے کے لیے کسی جگہ قیام ضروری ہو جائے تو پھر اہم درجے کی ضروریات بھی بہت ساری ہوتی ہیں۔ سر چھپانے کا انتظام، ایندھن اور روشنی کا انتظام، بستروں، کپڑوں اور برتنوں کا انتظام، بچوں کے لیے دُودھ کا انتظام، بیماروں کے لیے دوا دارو کا انتظام، پانی کا انتظام وغیرہ، یہ ضروریات بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں اور ان کے لیے موجودہ حالات میں بڑی مالی مدد چاہیے۔ اور ہماری ذمہ داری ہے کہ دنیا کے دوسرے لوگ مدد بھیجیں یا نہ بھیجیں، ہم اپنے مہاجر بھائیوں کو عزت و آبرو کے ساتھ تمام ضروریات فراہم کریں۔

کل جب وہ واپس جائیں تو اہلِ پاکستان کی محبت و اخوت کی قدر کا جذبہ لے کے جائیں۔ اس کی برکت سے آئندہ افغانستان کے عوام ہمیشہ پاکستان کے خیر خواہ رہیں گے۔ اور جو مخالف قوتیں

ان میں پاکستان کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتی رہی ہیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ لیکن اگر ہم نے کوتاہی کی اور ہماری بدسلوکی یا کم توجہی کی شکایات کا زہر ہمارے مہاجر مہمانوں کے دلوں میں رہ گیا تو وہ ہماری حسِ اسلامیت کا مرثیہ بن جائیں گے۔ ہماری آج کی غفلتیں افغانستان کے عوام کو ہمیشہ کے لیے ہم سے دُور کر دیں گی۔

ذرا سوچیے کہ کل خدا نخواستہ اگر کوئی ایسا موقع آجاتا ہے کہ پاکستان کے شہریوں کو افغانستان میں پناہ لینی پڑ جائے تو آج مہاجرین کے ساتھ کی ہوئی بدسلوکی یا بے توجہی کیا نتائج دے گی[1]۔

مَیں خاص طور پر اپنے اُن صاحبِ حیثیت بھائیوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں جو روپیہ کمانے میں، روپے سے کھیلنے میں اور روپے کو آگ لگانے میں گُم ہیں۔ جن کے دسترخوان پر بہار، جن کی تقریبیں پُرشکوہ، جن کے لباس فاخرہ، جن کے مشغلے جائز و ناجائز تفریحات و تعیشات ہیں۔ وہ جو لذّات کے لیے حرام کمائیوں میں محو ہیں، جو معیارِ زندگی بڑھانے کے لیے افراد اور قوم دونوں سے خیانت کرتے ہیں۔ بھائیو! تمہارے گھر کے آنگن میں خود انسانی زندگی لبسمل ہے، اس کے لیے معیارِ زندگی اور تعیشاتِ زندگی کا کیا سوال رہ جاتا ہے۔ تمہارے گھر میں اس تحریکِ جہاد کے مہاجرین وارد ہیں جو اپنی جنگ کے علاوہ تمہاری جنگ لڑ رہی ہے۔ افغانستان والے اگر رُوسی جارحیت کے آگے اپنے آپ کو دیوار بنا کے کھڑا نہ کر دیتے تو آج جنگ کا دیو خود تمہارے گھر میں خونی رقص کر رہا ہوتا۔ افغانستان کے مجاہدین اور مہاجرین ہمارے محسن ہیں، ہمارا مقام یہ نہیں کہ ہم اُن پر رحم کھانے والے بنیں، بلکہ ہمیں تو اُن کے احسان کے اعتراف کے طور پر اُن کی خدمت کرنی چاہیے۔

مگر کیا مجال کہ افغانستان کی تحریکِ جہاد یا کثیر التعداد مہاجرین افغانستان کے ورود کے بعد ہماری عادات و اطوار میں ذرا بھی فرق پڑا ہو، مشاغل میں کوئی بھی کوئی بھی تبدیلی آئی ہو یا سوچ بچار کے دھارے بدلے ہوں، ہر کوئی اپنی اپنی دلچسپیوں میں گُم ہے۔

---

[1] یاد رہے کہ کچھ مدت پہلے جب یہاں کے لوگ ترکِ وطن کر کے افغانستان میں گئے تھے تو وہاں کے افغان بھائیوں نے اُن کو عزت و احترام سے رکھا تھا اور اُن کی خدمت کی تھی۔ پڑوسی ملکوں میں دونوں طرف سے ایسے مواقع کئی بار آ سکتے ہیں۔

مہاجرین کی سب سے پہلی ضرورت سچی اخوت اور مخلصانہ ہمدردی کی ہے۔

مگر میں اپنے ماحول کے لوگوں کو دیکھ کر یہ کہتا ہوں کہ ہمارا یہ حال ہے کہ جیسے سرے سے مہاجرین کا موضوع ہی ہمارے ذہنوں سے خارج ہے۔ کتنے لوگ اس معاملے میں غور کرتے ہیں؟ کتنے مہاجرین کے احوال و ضروریات کو جاننے کی فکر کرتے ہیں؟ کتنے باہم دگر ملتے ہوئے اُن کی تکالیف پر گفتگو میں کرتے ہیں؟

پاکستان جیسے ملک میں تیرہ لاکھ مہاجروں کا پناہ گزین ہونا ایک بڑا واقعہ ہے۔ مگر اتنے بڑے واقعہ کی طرف ہماری توجہات منعطف نہیں ہوتیں۔

اُلٹا کبھی کبھار بعض روس پرست اور کارمل نواز عناصر کو افغان مہاجرین کے خلاف چہ میگوئیاں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان ظالموں میں ایک ایسے تخریب پسند اور انسانیت ناآشنا لوگ پائے جاتے ہیں جن کا بس چلے تو وہ مہاجرین پر حملہ آور ہو کر روس کے ہاتھ مضبوط کریں۔ ان عناصر کے ساتھ اپوزیشن کا ایک تلخ مزاج محاذ بھی شامل ہے جو موجودہ حکومت کے خلاف اپنے جذباتِ عناد کو ہر اس مسئلے میں استعمال کرنا چاہتا ہے جس کی حمایت حکومت کرے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ایسی عاقبت نااندیشانہ حرکات کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ نہ تو روس نواز کیمونسٹوں کو اور نہ اپوزیشن کے بے اصول اور تلخ مزاج دھڑے کو پاکستان کی محب اسلام اکثریت کے مقابلے میں ایسی جرأت ہو سکی کہ وہ مہاجرین کے معاملے میں کوئی ٹیڑھی حرکت کریں۔ اور آئندہ بھی خدا کی مشیت ان کے شر میں مانع رہے گی۔

پس ہر سچے مسلمان اور پاکستانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مہاجرین افغانستان سے محبت کرے، ان کی عزت کرے اور ان کو اہمیت دے۔ نیز انہیں اپنی بھرپور اخلاقی تائید بہم پہنچا کر ہر قسم کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا توڑ کرے۔

دوسری ضرورت خوراک، لباس، رہائشی سامان اور علاج معالجہ کے انتظام کی ہے۔

اس مسئلے سے عمومی تغافل کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ یہ خیال کر کے مطمئن ہوں کہ حکومت سب کچھ کر رہی ہے۔ بلاشبہ حکومت نے اپنی قوم کی طرف سے بڑی بھاری ذمہ داری اٹھا

رکھی ہے، مگر کوئی بھی حکومت عوام کے بھرپور تعاون کے بغیر بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی درست ہے کہ کچھ نہ کچھ لوگ مہاجرین کے لئے انفاق کرتے بھی ہیں۔ بعض وہ جو تصویر و تشہیر کے ساتھ، اور بعض وہ جو خاموشی سے محض حصولِ رضائے الٰہی کے لئے۔ مگر اب تک جو کچھ جس رفتار سے ہوا ہے وہ کافی نہیں ہے۔

پھر مہاجرین کے متعلق وہی ٹیڑھے مزاج کے لوگ یہ بات پھیلاتے رہتے ہیں کہ اجی مہاجرین کا کیا ہے، وہ تو ٹرک اور گاڑیاں لے کر آئے ہیں اور وہ تو یہاں آکر کاروبار کر رہے ہیں۔ ان کو کسی کی مدد کی کیا ضرورت! یہ فقرہ سنتے ہی ہر آدمی کے متحرک جذبات بالکل ساکن ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ مہاجرین کا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔

۱۳ لاکھ مہاجرین کے ساتھ ۱۳ لاکھ گاڑیاں تو نہیں آگئیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مہاجرین کے قافلے جب گھروں سے نکل کے آئے ہیں تو جس کے بس میں تھا اس نے گاڑی بھی ساتھ لے لی۔ ایسے لوگ کتنے ہوں گے؟ ۱۳ لاکھ تو کیا، ۱۳ سو بھی نہیں ہوں گے۔ تھوڑے سے افراد کو اگر ایسا موقع مل بھی گیا تھا تو یہ اچھی بات ہوئی کہ وہ ایک قیمتی مشینری پاکستان میں لے آئے۔ اور یہ بھی بری بات نہیں کہ کوئی شخص اگر ٹرک یہاں لے آیا ہے تو اسے کھڑا رکھنے کے بجائے وہ چلاتا ہے اور اس سے کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ مگر ایک ٹرک کی آمدنی سے پانچ دس ہزار افراد کی گزر بسر تو نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اگر چند مہاجرین خوانچہ لگا لیتے ہیں یا کہیں مزدوری کر لیتے ہیں تو اس سے بھی ۱۳ لاکھ افراد (جن میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں، زخمیوں اور معذوروں کی مجموعی تعداد زیادہ ہے) کی معاش تو پوری نہیں ہو جاتی۔

اس سے پہلے پاکستان نے ایسے بھی مہاجرین دیکھے ہیں جن کے مرد، عورتیں اور بچے مسجدوں کے سامنے، سٹیشنوں اور بسوں کے اڈوں اور بازاروں میں مانگتے پھرتے تھے۔ آفرین ہے افغان مہاجرین پر کہ ان کی غیرت نے ان کو گداگری کی اجازت نہیں دی۔ اگر ان کے چند افراد اپنی ضروریات کے لئے کوئی کام کاج یا محنت کر لیتے ہیں تو اس سے ہزار درجے بہتر ہے کہ وہ جا بجا مانگتے نظر آتے۔ اس لحاظ سے یہ مہاجرین دنیا بھر کے لئے ایک اچھا نمونہ اور ہمارے لئے قابل فخر ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ مہاجرین کمبل، و دوسری اشیاء کو بیچ لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں امداد

دینے کا کیا حاصل؟ اصل صورت یہ ہے کہ جس مہاجر کو ۵، ۶ سو روپے والا ولایتی کمبل ملتا ہے، وہ اس قیمتی کمبل کو بیچ کر چالیس پچاس روپے کا پرانا کمبل حاصل کر لیتا ہے اور بقیہ رقم سے وہ اپنی دوسری بہت سی ضروریات پوری کرتا ہے جو امدادی رقم اور سامان سے پوری نہیں ہوتیں۔ اسی طرح اگر مہاجرین ولایتی بسکٹوں یا پنیر کے ڈبوں کو بیچ کر دال سبزی لے لیں تو اس کے معنی یہ کیسے ہوئے کہ وہ لوگ امدادی سامان کو یونہی اڑا دیتے ہیں۔

ایک تیسری غلط فہمی اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والی امدادی رقوم اور خود ملک کے اندر سے دیے جانے والے عطیات کا اخبارات اور ریڈیو میں جب اعلان ہوتا ہے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امداد تو مل رہی ہے اب اور آخر کیا چاہیے۔ مثلاً آپ نے سنا کہ ۲ لاکھ ڈالر آئے ہیں یعنی ۹٫۲ لاکھ روپے۔

اب ذرا تقسیم کر کے دیکھیے، یہ ہوا تقریباً ڈیڑھ روپیہ فی کس۔ کیا خیال ہے آپ کا ڈیڑھ روپیہ فی کس لے کر کوئی بھی گھر وقت گزاری کر سکتا ہے۔ محض کھانے کا سامان بھی پورا کر سکتا ہے؟ پھر مسئلہ ایک دن کا نہیں، زیادہ وقت کا ہے۔

آپ یوں حساب لگائیں کہ اگر مہاجرین پر فی کس ایک روپیہ کا خرچ یومیہ محسوب کیا جائے تو پورا سال گزارنے کے لیے ۴۷ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ایک روپیہ فی کس میں ضروریات پوری کرنا ناممکن ہے۔ رہنے سہنے اور کھانے پینے سے لے کر علاج معالجہ تک کی ساری ضروریات کو سامنے رکھ کر اگر آپ پانچ روپے فی کس کے مصارف کا ادنیٰ ترین تخمینہ لگائیں تو مطلوبہ رقم دو ارب ۲۷ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے ہوگی۔

بس اسی پر تکیہ کر لینا کہ فلاں ملک سے اتنے لاکھ یا کروڑ سکے آگئے، یا صدر صاحب کے فنڈ میں چند کروڑ روپے جمع ہو گئے ہیں۔ زندگی کے حقائق سے تغافل کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

سارے عطیات اور اعانتوں کے باوجود اصل بھاری ذمہ داری باشندگانِ پاکستان کے سر ہی عاید ہوتی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ عطیات اور چندوں کی رقوم کی تو اخبارات اور ریڈیو سے پبلسٹی (باقی بر صفحہ ۴۵)

ہجرت اور جہاد

از ڈاکٹر ابوالفتح محمد صغیر الدین
(صدر شعبہ تقابل ادیان وثقافت اسلامی - جامعہ سندھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی وجہ سے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی میں ایک خصوصیت پیدا ہو گئی اور اُن کو ایک تقدس حاصل ہو گیا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ لیکن جب آپ ہجرت کر کے یثرب تشریف لے گئے تو اُسے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر کہا جانے لگا۔ پھر کثرتِ استعمال اور اختصار کی بنا پر صرف مدینہ مشہور ہوا۔ حالانکہ مدینہ کے معنی تو مطلقاً شہر کے ہیں، خواہ وہ کوئی شہر ہو، لیکن اب لفظ مدینہ کا اطلاق اس خاص شہر پر ہوتا ہے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور شہر کو مدینہ نہیں کہا جاتا ہے اور اس کو جو تقدیس حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اسی طرح لفظِ ہجرت اور جہاد بھی ہے۔ ہجرت اور جہاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بہت ہی اہمیت حاصل ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں الفاظ کے معانی میں آپ کی سیرت کے تعلق سے کیا خصوصیت پیدا ہو گئی ہے اور آپ کی سیرت ہی کے تعلق سے ان الفاظ نے کس قدر تقدس حاصل کر لیا ہے۔

ہجرت

پہلے تو ہجرت کا لفظ دیکھیں کہ لغت میں تو اس کے معنی ہیں چھوڑ دینا یا جدا ہونا۔ اس لیے ترکِ وطن کو بھی ہجرت کہتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے تعلق کی بنا پر اب ایک مخصوص واقعہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ منتقل ہونے کو ہجرت کہتے ہیں اور اسی واقعہ پر اسلامی کیلنڈر کی بنیاد بھی رکھی گئی ہے۔ آپ کی سیرت کے تعلق سے اس لفظ کا یہ مفہوم ذہن میں آتا ہے کہ جب وطن میں اپنے دین اور عقیدہ کے مطابق زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے تو اپنے وطن کو خیرباد کہہ دینا ہجرت ہے۔ ہر ترکِ وطن ہجرت نہیں بلکہ وطن اس لیے چھوڑنا کہ دوسری جگہ جا کر اپنے دین اور عقیدے کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس کا مقصد مالی منفعت یا دنیوی فائدہ نہ ہو، بلکہ دینداری کی زندگی گزارنا مقصود ہو۔ ترکِ وطن تو بہت لوگ کرتے ہیں لیکن ان کے اس عمل کو محض اس بنا پر ہجرت نہیں کہا جا سکتا کہ بظاہر ترکِ وطن کے لحاظ سے اس کو ہجرت کے عمل سے مشابہت ہے۔ کیونکہ دو عمل بظاہر اگرچہ یکساں ہوں لیکن: نیت اور قصد کے اعتبار سے ان کے اثرات اور احکام مختلف ہوتے ہیں۔ قابیل اور ہابیل دونوں بھائیوں نے بظاہر قربانی ہی دی تھی۔ لیکن نیتوں کے فرق کی وجہ سے ایک کی قربانی تو مقبول ہوئی لیکن دوسرے کی مقبول نہ ہوئی۔ اور جب قبول نہ ہوئی تو حسد کے مارے قابیل نے اپنے بھائی کو مار ڈالا اور ایک ایسے گناہ کی ایجاد کا مرتکب ہوا کہ قیامت تک روئے زمین پر جتنے قتل بھی ہوں گے سب کا ایک حصہ وبال اُس کی گردن پر ہوگا۔ دوسری طرف اس کے بھائی کا کردار تھا جس نے بھائی کی طرف دست درازی کرنے سے انکار کر دیا۔ قربانی کا عمل بظاہر یکسان تھا لیکن نیت اور قصد کے فرق کی وجہ سے اثرات مختلف ہوئے اور اُن کے کردار میں اختلاف ہوا۔

بعینہٖ یہی حال ہجرت کا ہے کہ دین کے لیے گھر بار چھوڑ دینے والوں کا کردار اُن سے مختلف ہوگا جو دنیا کمانے کے لیے ترکِ وطن کریں۔ اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے کے اس کردار کو چشمِ تصور سے دیکھیے کہ جن لوگوں نے تیرہ سال تک ہر قسم کے ظلم وستم کیے۔ اور اب جان کے درپے ہو کر ختم کر دینے کے لیے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، جبکہ خود ان ظالموں ہی کا مال بھی اس گھر میں

بطور امانت رکھا ہوا تھا۔ اس حالت میں اپنے گھر سے نکلنے والے مہاجر کے لیے بہت ہی نادر موقع تھا کہ امانت کا مال ساتھ لے جائے، کسی کو اس پر تعجب بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ دنیا میں عام سطح پر دشمنوں کا مال ہضم کر لینا ہی عین دانشمندی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ جانے والے نے رخصت ہوتے وقت سب سے پہلے اس بات کا اہتمام کیا کہ امانت کا مال اُن کے مالکوں کے پاس پہنچ جائے۔ کیا دنیا کی غرض سے ہجرت کرنے والے کا کردار ایسا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔

پھر دیکھیے کہ ابتداءً حبشہ کی طرف جن لوگوں نے ہجرت کی تھی، اور مکّہ کے لوگ ان کو واپس لینے کے لیے نجاشی کے دربار میں پہنچے اور نجاشی کے ذہن میں غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان مسلمانوں سے ان کا عقیدہ دریافت کیا تو ان لوگوں نے ایسے نازک موقع پر نتائج کی پروا کیے بغیر نجاشی کے سامنے اپنے عقیدے کا صاف صاف اعلان کیا کہ "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اُس کی طرف سے ایک رُوح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا تھا"۔ یہ موقع ایسا تھا کہ اگر نجاشی ان مسلمانوں سے ناراض ہو جاتا تو ان سب مسلمانوں کو اپنے ہاں سے نکال دیتا اور ان ظالموں کے حوالے کر دیتا جو ان مسلمانوں کے تعاقب میں آئے تھے۔ لیکن چونکہ ان ہجرت کرنے والوں کا مقصد جان بچانا یا مالی فائدہ حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ صرف اپنے دین کی حفاظت کرنا تھا، اس لیے انھوں نے وہی بات کہہ دی جو ان کے دین نے انھیں سکھائی تھی۔ اس کے برخلاف اگر اُن کا مقصد دُنیاوی مقصد حاصل کرنا ہوتا تو یقیناً ان کا رویہ اس سے مختلف ہوتا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں مہاجرین کی حالت بہت خستہ تھی، اس لیے آپ نے ہر مہاجر کو ایک ایک انصاری کے ساتھ رشتۂ اخوت میں منسلک کر دیا۔ اس تعلق کو اسلامی تاریخ میں عقدِ مواخاۃ یعنی بھائی چارے کا عقد کہتے ہیں۔ یہ بھی دُنیا کا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ جس مہاجر کو جس انصاری کے ساتھ منسلک کیا گیا وہ ایک دوسرے کے لیے حقیقی بھائی کی طرح ہو گیا۔ اور انصار نے مہاجرین کی جو مدد کی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ انصار نے اپنے مال کے دو حصے کیے اور اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ اس میں جو تمھیں پسند ہو لے لو۔ حد یہ ہے کہ بعض نے یہ پیش کش بھی کی کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے دیں تاکہ مہاجر بھائی اُس سے نکاح کر لے۔ حضرت

عبدالرحمن بن عوف کے سامنے پیش ہوا لیکن انہوں نے اپنے انصاری بھائی کا شکریہ ادا کیا اور کہا تمہارا مال اور تمہاری بیوی تمہیں مبارک ہو۔ تم تو مجھ کو بازار کا راستہ بتاؤ۔ میں کوئی کاروبار کروں گا ـــــ! مہاجرین اور انصار کے تعلقات اور ان دونوں کے اعلیٰ کردار اور ایثار کے متعلق تاریخ نے بہت سے واقعات محفوظ رکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کا ترکِ وطن کسی دنیاوی فائدہ کے لیے نہیں تھا، اور نہ انصار کا ایثار کسی دنیاوی غرض پر مبنی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کر کے ہجرت کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اب ہجرت کا لفظ ایک اصطلاح بن گیا ہے جس کا مفہوم محض ترکِ وطن نہیں، بلکہ اس کے معنی کچھ اور ہو گئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ۔[1]

(یعنی ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اس نے نیت کی۔ چنانچہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف شمار ہوگی، اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی کی طرف شمار ہوگی جس کے لیے ہجرت کی ہو)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ :۔ اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَاجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ (مہاجر وہ ہے جو اس چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے)۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تعلق سے اس لفظ اور عمل نے انتہائی تقدس کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ واقعہ اسلامی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے[2] کہ اس کے بعد دین کو مکمل کیا گیا

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، بحوالہ بخاری و مسلم۔

[2] نوٹ از ایڈیٹر۔ ہجرت درحقیقت انقلابی عمل ہے۔ ایک خدا پرست شخصیت یا قوم ایک طرح کے ماحول کو اگر دعوتِ حق کے سازگار نہیں پاتی تو وہ نیا سازگار ماحول تلاش کرتی ہے جہاں نیکی کا پودا (باقی برصفحہ آئندہ)

اور اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ اسی لیے اس واقعہ سے اسلامی کیلنڈر کی ابتدا کی گئی۔

ہجرت کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے اس عزم کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی رضا کے لیے وطن، املاک اور اعزہ و اقربا کی محبت کو قربان کر دینا اُن کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ہجرت کے معنی یہ نہیں کہ سابقہ وطن کی محبت ہی اس کے دل سے ختم ہو جائے۔ وطن کی محبت جہاں آدمی پلا اور بڑھا ہو فطری ہےلے۔ لیکن اس فطری جذبہ کو بھی اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے تو یہ کمال ہے۔ جس طرح کہ ماں باپ، اولاد اور مال کی محبت فطری ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ ماں باپ اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت مجھ سے نہ رکھے۔ اسی طرح گو وطن کی محبت فطری ہے لیکن مطالبہ یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اس محبت کو بھی پس پشت ڈال دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے لیے گھر سے باہر نکلے تو کعبہ کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ اے مکہ تو مجھ کو تمام دنیا سے عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔ حضرت بلالؓ کے متعلق بھی مذکور ہے کہ مکہ کی گلیوں اور وہاں کے پودوں اور درختوں کو یاد کرتے۔

جہاد

ہجرت کے بعد جہاد کی اصطلاح ہے۔ اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

پنپ سکے۔ ہجرت ایک طرح کے مانع تغیر حالات میں پڑے رہنے کے بجائے اُن کے گھیرے سے نکل کر دُنیا لئے نو پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ یہ محض نقل مکانی کا نام نہیں ہے۔ بیشتر انبیاء نے اپنے پیروؤں کو ساتھ لے کر ہجرت کی ہے اور نسبتاً آزاد ماحول میں پہنچ کر جماعت کی تنظیم و تربیت کا کام مکمل کر کے جہاد کے مرحلے میں قدم رکھا ہے۔ ہجرت اکثر جہاد کا دیباچہ بنتی رہی ہے۔

لے (حاشیہ صفحہ ہذا) کسی سچے مہاجر کو سابق وطن سے جو محبت ہوتی ہے اُس کا بہترین مظہر یہ آرزو ہوتی ہے کہ متروکہ وطن میں بھی اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ (ایڈیٹر)

ایک گہرا تعلق ہے۔ جہاد کے معنی تو لغت میں کوشش کے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ اس کے تعلق کی وجہ سے اس کے معنی میں ایک خصوصیت پیدا ہوگئی وہ یہ کہ اصطلاحاً ہر کام کے لیے کوشش کرنے کو جہاد نہیں کہتے بلکہ جہاد صرف اس کوشش کا نام ہے جو دین کی سربلندی کے لیے اور اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے کی جائے۔ اس لحاظ سے ہجرت کی طرح یہ عمل بھی ایک مقدس عمل بن گیا اور اس لفظ نے بھی ایک تقدس حاصل کر لیا ہے۔ لیکن افسوس کہ مخالفین کی طرف سے اس عمل کی ایسی بھونڈی تصویر کشی کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ عمل بھیانک اور کسی حد تک قابلِ نفرت سمجھا جانے لگا۔ جہاد کا یہ مفہوم ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی کہ جہاد صرف جنگ و جدال، قتل و غارتگری کا نام ہے۔ اور اس کے ثبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ جنگیں پیش کی جاتی ہیں جو آپ کو مدینہ میں پیش آئیں۔ اس لحاظ سے مکی زندگی جہاد کی زندگی شمار نہ ہوگی۔ کیونکہ اس دوران کوئی جنگ نہ ہوئی۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ جہاد کا حکم مکہ ہی میں نازل ہوچکا تھا۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيرًا فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (الفرقان - ۵۲)

(اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ڈرانے والا بھیجتے۔ پس کافروں کی اطاعت مت کرو، اور اُن لوگوں کے ساتھ خوب جہاد کرو)

یہ آیت مکی ہے۔ اس لیے جہاد کو صرف مدنی زندگی سے متعلق کرنا صحیح نہیں ہوگا، بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ کی مکی زندگی بھی سر تا پا جہاد ہے۔ کیونکہ اگر مکی زندگی میں لوگوں کی کردار سازی کے لیے اور دلوں میں ایمان و یقینِ محکم پیدا کرنے کے لیے کوشش نہ کی جاتی تو نہ لوگ ہجرت کرتے اور نہ بدر و اُحد اور دیگر معرکوں کی نوبت آتی اور نہ فتح سے ہمکنار ہوتے۔ ہاں کوشش کی شکلیں مختلف ہیں۔ مکی زندگی میں کلمۂ حق کو بلند کر کے ظلم و ستم اور مصائب برداشت کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی سکھایا جا رہا تھا کہ مظلومی کی زندگی میں اپنے دین و ایمان کو کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ خدا ہی کا خوف اور اسی سے امیدیں قائم کرنے کا تصور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و اطاعت اور آخرت میں جواب دہی کا یقین جو مسلمانوں کو حاصل ہوا وہ دراصل حضورؐ کی مکی دور ہی کی کوششوں

کا نتیجہ تھا۔

جہاد اور قتال (یعنی جنگ) میں فرق کرنا چاہیے۔ جہاد عام ہے اور قتال بہ معنی جنگ، جہاد کی مختلف شکلوں میں سے ایک آخری شکل ہے۔ نہ تو ہر جنگ جہاد ہے اور نہ جہاد جنگ ہی میں منحصر ہے۔ بلکہ ہر وہ کوشش جہاد ہے جو اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے کی جائے۔ اور ان کوششوں میں جنگ کی نوبت بھی آتی ہے۔ اس لیے وہ جنگ بھی جہاد شمار ہوگی جو اللہ کی راہ میں کی جائے۔ جنگ کی شکل تو یکساں ہوتی ہے لیکن اس شکل کی یکسانیت کے باوجود نیتوں کے فرق کی وجہ سے اُن کے اثرات مختلف ہوتے ہیں، اُن کے احکام جُدا ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو دوسرا طاغوت کی راہ میں لڑتا ہے۔ چنانچہ دونوں کے کردار میں بیّن فرق ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑنے والا اپنے دشمنوں کی فصلوں کو تباہ نہیں کرتا، اُن کے سامان اور گھر بار کو نہیں لوٹتا، اُن کی عبادت گاہوں کو ہاتھ نہیں لگاتا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر تلوار نہیں اُٹھاتا۔ اُن کے مقتولوں کا مُثلہ نہیں کرتا۔ جوشِ انتقام میں اُن کے اعضا کاٹ کر نہیں چباتا۔ جنگ کے قیدیوں کو تکلیفیں نہیں دیتا، بلکہ جو خود کھاتا ہے وہی انہیں کھلاتا ہے، جو لوگ ہتھیار رکھ دیں اُن سے تعرض نہیں کرتا ہے، اور جو امان طلب کریں تو انہیں امان دے دیتا ہے، اور شہر میں فاتحانہ داخل ہو تو اکڑ فوں کے بغیر داخل ہوتا ہے اور اپنے مخالفین کو عام معافی دے دیتا ہے[1]۔ یہ ہے اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والوں کے کردار کی ایک مختصر سی جھلک!

اس کی پوری تفصیل احادیث کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اس کے برعکس طاغوت یا غیر اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والوں کا کردار کیا ہوتا ہے، اس کا نقشہ قرآن نے ایک آیت میں بہت ہی جامع طور پر کھینچا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً (النمل-۳۴) یعنی جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد مچاتے ہیں۔ اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔

ہم سے شکوہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ خونی ہے۔ ہم جنگجو ہیں، ظالم ہیں، خونخوار اور وحشی ہیں۔

---

[1] بعض خاص قسم کے مجرمین کو سزائیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

لیکن امن کے ان جھوٹے نقیبوں سے کون کہے کہ اس صدی سے پہلے کی صدیوں کو تو جانے دو صرف اسی ایک صدی میں دو خونی جنگوں کی آگ بھڑکا چکے ہو۔ جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ہیروشیما اور ناگا ساکی اب تک سسک رہے ہیں۔ جان و مال کا جو نقصان ہوا وہ تم ہی کو معلوم ہوگا۔ اور حالات کے تیور تو بتا رہے ہیں کہ شاید اسی صدی میں تیسری جنگ کی آگ بھی بھڑکا دو گے اور یقین ہے کہ اس آگ کے شعلوں سے نہ کوئی فاتح محفوظ رہے گا اور نہ مفتوح، بلکہ سب اس آگ میں بھسم ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر ان جنگوں میں انسان اخلاقی طور پر وحشی اور درندہ ثابت ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تعلق سے جنگ امن و امان کا ذریعہ بنتی ہے، تباہی اور ہلاکت کا ذریعہ نہیں۔ اللہ کی رضا کے لیے جو جنگ کی جائے وہ مقدس بن جاتی ہے۔ اور اس راہ میں جان دینے والے کا مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو مُردہ کہنے کی ممانعت ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور یہ جنگ جہاد کی صرف ایک شاخ ہے۔ ورنہ ایک مسلم کی زندگی تو سراسر جہاد ہی ہوتی ہے کہ کبھی وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے کوشش کرتا ہے، کبھی شیطان سے محفوظ رہنے کی کوشش میں مصروف ہے، کبھی کفار و مشرکین سے معرکہ آرائیوں میں لگا ہوا ہے، کبھی کسی کمزور اور مظلوم آبادی کی فریاد سن کر اسے نجات دلانے کے لیے ظالم حکمرانوں سے ٹکر لیتا ہے، کبھی سلطانِ جابر کے سامنے تلوار کے زیرِ سایہ کلمہ حق پکار رہا ہے، کبھی کسی ایمان دشمن اکثریت کی چیرہ دستیوں کے باوجود ثبات و استقلال سے اپنے دین پر قائم رہتا ہے اور جہاں موقع ملے غیروں کے تسلط سے نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہجرت بھی جہاد ہی کی ایک قسم ہے۔

امام نسائیؒ

۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ

جناب عبد الرشید عراقی

نام و نسب | نام احمد اور کنیت ابو عبد الرحمٰن

آپ کی پیدائش بمقام نساء ہوئی جو مضافات مرو میں ہے۔ مرو خراسان کا ایک شہر ہے[1]۔ آپ کا سالِ پیدائش ۲۱۵ھ ہے، جیسا کہ ابن حجرؒ نے امام صاحب کا اپنا قول نقل کیا کہ یشبہ أن یکون مولدی فی سنۃ ۲۱۵ھ[2]

تحصیلِ علم | ابتدائی تعلیم خراسان میں حاصل کی۔ اس لیے کہ اُس وقت خراسان علم و فضل کا مرکز اور جید علمائے کرام کا مسکن تھا۔

تحصیلِ علم کے لیے سفر | خراساں میں پندرہ سال گزارنے کے بعد تحصیلِ علم کے لیے سفر شروع کیا۔ ۲۳۰ھ میں سب سے پہلے قتیبہ بن سعید کی خدمت میں بمقام بلخ حاضر ہوئے[3] اس کے بعد آپ نے مختلف شہروں کے شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کیا۔ یعنی حجاز، عراق، مصر، شام، جزیرہ وغیرہ ذالک[4]۔

---

[1] مرقاۃ - ص ۹۳
[2] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸
[3] بستان المحدثین - ص ۱۴۲، سیرۃ البخاری ص ۳۵۴
[4] بستان المحدثین ص ۱۴۲

اساتذہ وشیوخ آپ کے اساتذہ میں سے قتیبہ بن سعید، اسحاق بن راہویہ، امام ابوداؤد سجستانی، علی بن حجر اور امام محمد بن اسمٰعیل البخاری جیسے بلند پایہ محدث شامل ہیں[1]۔

تلامذہ امام نسائی کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبانِ حدیث کے لیے مرجع بنا دیا تھا۔ ان کے تلامذہ میں دُنیا کے مختلف گوشوں کے اصحاب کی فہرست ملتی ہے۔ آپ کے تلامذہ بھی اپنے زمانے کے اساطینِ فن تھے۔ چند مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

ابوبکر بن احمد بن محمد بن اسحاق ابن السُنی، محمد بن قاسم الاندلسی، امام علی بن جعفر طحاوی، امام ابوالقاسم طبرانی[2]۔

مصر میں قیام تکمیلِ تعلیم کے بعد امام صاحب نے اپنے علوم کی نشر واشاعت کے لیے مصر کو مرکز بنایا۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:۔

"در مصر مسکن داشت وتصانیفِ او درون دیار منتشر است ومردم بسیار ازو اخذ وتحمل حدیث کردہ اند۔ پس از مصر بدمشق آمد[3]"

ترجمہ۔ مصر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ اُن کی تصانیف اسی اطراف میں پھیلیں اور بہت سے لوگوں نے امام صاحب سے اخذ و روایت حدیث کیا ہے۔ آخری زندگی میں (ذیقعدہ ۳۰۲ھ) مصر سے دمشق آگئے۔

زہد وتقویٰ زہد وتقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔ صومِ داؤدی کے پابند تھے۔ یعنی ایک دن روزہ رکھتے اور دوسرے دن افطار کرتے[4] دن رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزارتے۔ کئی بار حج کیے۔ بادشاہوں کی مجالس سے ہمیشہ گریز کیا۔ اس کے باوجود کھانے پینے میں ہمیشہ کشادہ دست رہے[5]۔

علماء ومعاصرین کا اعتراف مؤرخ ابن خلکان فرماتے ہیں:۔ "کان امام عصرہ فی الحدیث[6]"

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۷

[2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۴۳

[3] اشعۃ اللمعات جلد ۱ ص ۱۷

[4] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۶۵ [5] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۸۸

[6] ابنِ خلکان جلد ۱ ص ۰۵

یعنی اپنے زمانے کے امام حدیث تھے۔

ابوسعید عبدالرحمٰن تاریخِ مصر میں امام صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "کان اماماً فی الحدیث ثقۃ ثبتاً حافظاً"[۱] یعنی وہ حدیث میں امام ثقہ، معتبر اور حافظ تھے۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں:۔ "ابوعبدالرحمٰن نسائی اپنے زمانے کے تمام محدثین سے (شیخین کے بعد) بلند و آونچے تھے"[۲]

حافظ ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے: "وہ بغیر کسی تقابل کے حدیث میں امامت کا درجہ رکھتے تھے"[۳]

حافظ ابن حجر نے بہت سے ائمہ کرام اور محدثینِ عظام کے اقوال نقل کیے ہیں۔ جنہوں نے امام نسائی کی رفعتِ شان وفضل کا اعتراف کیا ہے[۴]

امام نسائیؒ کا مسلک | دیگر محدثین کی طرح امام نسائی کے مسلک میں بھی اختلاف ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) فرماتے ہیں: "او شافعی المذہب بود، چنانچہ مناسک او برآں دلالت می کند"[۵]

محی السنہ۔ والاجاہ نواب صدیق حسن خاں رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) فرماتے ہیں: "امام نسائی شافعی المسلک تھے"[۶]

امام ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ "امام نسائی کا انتساب شافعی مسلک کی جانب مناسب ہے"[۷]

لیکن مولانا سید انور شاہ محدث کشمیری (م ۱۹۳۴ء) فرماتے ہیں کہ "امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ حنبلی تھے"[۸]

---

[۱] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۵۹

[۲] تہذیب التہذیب [۳] ایضاً [۴] ایضاً

[۵] بستان المحدثین ص ۱۲۳ [۶] ابجد العلوم ص ۸۱۰

[۷] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ۔ ص ۸۰ [۸] فیض الباری جلد ۱ ۔ ص ۵۸

تصنیفات امام صاحب نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

السنن الکبریٰ والصغریٰ، خصائص علیؓ، مسند علیؓ، مسند مالک الکنی، عمل یوم ولیلۃ، اسماء الرواۃ والتمییز بین الضعفاء والمتروکین (فی رواۃ الحدیث)، والاغوۃ ما اغرب شعبۃ علی سفیان و سفیان علی شعبہ، مسند منصور بن زاذان[1]، کتاب الجمعہ اور کتاب المدلسین[2]۔

سنن کی تالیف امام نسائی کی تالیفات میں سنن کے نام سے دو کتابیں ہیں۔ سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ لیکن صحاح میں سنن صغریٰ شامل ہے، جس کا دوسرا نام المجتبیٰ ہے۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ "امام نسائی جب سنن الکبریٰ کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو امیر رملہ[3] کی خدمت میں پیش کیا۔ امیر موصوف نے دریافت کیا کہ کیا سنن الکبریٰ میں کل احادیث صحیح ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا: نہیں۔ فرمانروائے وقت نے عرض کیا کہ آپ صحیح احادیث کو ان سے منتخب کیجیے۔ تب امام صاحب نے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی[4]۔"

علامہ ابن اثیر نے جامع الاصول اور ملا علی قاری نے مرقاۃ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے[5]۔

سنن نسائی کی خصوصیت امام نسائی زمانہ کے لحاظ سے صحاح ستہ میں سب سے مؤخر ہیں اور اپنے استاد امام محمد بن اسمٰعیل البخاری سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی کتاب سنن میں شیخین کے طریقے کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے۔ اس کے ساتھ یہ کتاب حسن ترتیب اور جودت تالیف میں بھی ممتاز ہے۔

---

[1] تدریب الراوی ص ۵۱۶

[2] بستان المحدثین ص ۱۲۵

[3] رملہ فلسطین بیت المقدس سے ۱۸ میل پر واقع ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دار السلطنت تھا۔ اور اب غیر آباد ہے۔ (معجم البلدان)

[4] بستان المحدثین ص ۱۲۳ - سیرۃ البخاری ص ۲۳۰

[5] مرقاۃ جلد ۱ ص ۲۳

امام ابن رشد فرماتے ہیں:-

"یہ کتاب علم سنن میں جتنی کتابیں تالیف ہوئی ہیں۔ ان سب میں تصنیف کے لحاظ سے انوکھی اور ترتیب کے لحاظ سے بہترین ہے اور بخاری و مسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے۔ نیز علل حدیث کے ایک خاص حصّہ کا بیان بھی اس میں آگیا ہے" [1]

سنن کے محاسن و فضائل سنن کے بارے میں محدثین نے اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ابو الحسن معافری [2] علامہ سخاوی [3] اور محدث ابن الاحمر کہتے ہیں کہ "یہ اس فن کی تمام مصنفات سے افضل ہے اور اسلام میں اس کی مانند کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔" [4]

سنن نسائی کی شروح و تعلیقات مجموعۂ سنن نسائی صحاح ستہ کا رکن عظیم ہے، مگر افسوس اس کے شروح و تعلیقات کی طرف وہ توجہ علماء نے نہیں کی جو دیگر کتب کی طرف کی گئی۔ چھ صدی گزرنے کے بعد امام جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اس پر تعلیق لکھی۔ امام جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ:-

"جس طرح صحیحین، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی پر میں نے تعلیقات لکھی ہیں، اسی طرح سنن نسائی پر تعلیق لکھی ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ اور میں نے اپنی اس تعلیق کا نام زہر الربیٰ رکھا ہے" [5]

امام سیوطی کی یہ تعلیق بہت سی خوبیوں کی حامل ہے [6]

دوسری تعلیق یا حاشیہ محمد بن عبد الہادی سندی (م ۱۱۳۸ھ) کا ہے۔ یہ حاشیہ امام سیوطی کی تعلیق سے زیادہ مفصل ہے۔ اس میں متن کے ضروری مقامات کا حل اور اعراب کی تحقیق اور الفاظ غریبہ کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ دونوں حاشیے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں [7]

---

[1] مقدمہ زہر الربیٰ [2] ایضاً

[3] فتح المغیث ص ۱۴ [4] ایضاً ص ۳۳ - مقدمہ فتح الباری۔

[5] مقدمہ زہر الربیٰ

[6] محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے۔ ص ۲۳۷

[7] ایضاً ص ایضاً

حاشیہ سنن نسائی (عربی) المعروف بہ التعلیقات السلفیہ

مولانا ابوالطیب محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مدظلہ العالی مدیر ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) نے سنن نسائی کا جو حاشیہ لکھا ہے۔ وہ بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس حاشیہ کی امتیازی خصوصیات ایسی ہیں، جن سے اس کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ متعدد و مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے متنِ کتاب کی تصحیح میں امکانی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں ایک نسخہ وہ ہے جو حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کا تصحیح فرمودہ ہے۔

۲۔ التعلیقات السلفیہ میں علامہ سندھی کا حاشیہ سنن نسائی شریف پورے کا پورا لے لیا گیا ہے۔ بلکہ علامہ سندھی کے صحاحِ ستہ کے دوسرے حواشی سے بھی مناسب مقامات پر ضروری اضافے کیے گئے ہیں۔

۳۔ علامہ سیوطی کے حاشیے زہر الربیٰ کی جامع تلخیص کر لی گئی ہے۔ اس طرح کی علامہ سندھی کے حواشی میں جو حصے نہیں آتے وہ زہر الربیٰ سے لیے گئے ہیں۔ اس طرح دونوں حاشیے کامل طور سے آگئے ہیں۔

۴۔ زہر الربیٰ اور تعلیقِ سندھی کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں اب تک جو بیاض چلے آرہے تھے، ان میں بعض عبارات کا مطلب خبط ہو جاتا تھا۔ حاشیہ میں دونوں شارحین کی دوسری تصانیف اور اُن کے ماٰخذ کی طرف رجوع کر کے اُن کی تصحیح و تکمیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۵۔ ۱۳۱۵ھ میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے اہتمام سے مطبع انصاری دہلی میں جو سننِ نسائی طبع ہوئی تھی وہ سابقہ سب اشاعتوں سے ہر لحاظ سے عمدہ تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ضبط و تحقیقِ رجال کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے۔ اس بنا پر اس کو اصل قرار دیا گیا ہے اور اس کے حواشی (الحواشی الجدیدہ) کا اکثر و بیشتر حصہ اس میں آگیا ہے۔

۶۔ خوش قسمتی سے علامہ حسین محدث یمانی اُستاد حضرت نواب صدیق حسن (م ۱۳۰۷ھ) کا سنن نسائی پر مختصر سا حاشیہ دستیاب ہو گیا ہے جو علامہ محدث کے پوتے علامہ خلیل عرب نے مرحمت فرمایا۔ یہ قیمتی حاشیہ اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ یہ حاشیہ بھی تعلیقاتِ سلفیہ کی زینت ہے۔

۷۔ سنن نسائی شریف کی تعلیم و تعلّم کے وقت جو اشکال پیش آتے تھے، متعلقہ اسناد و متعلقہ تطبیق

احادیث بہ الواب التعلیقات السلفیہ میں ان کے حل کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔

۸۔ التعلیقات السلفیہ میں بعض ایسے مباحث بھی آگئے ہیں، جو مروجہ شروحِ حدیث میں اس طرح منقح طریق سے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کے فوائد حدیثیہ کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

۹۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے احادیث کا شمار دے دیا گیا ہے اور ایسا انڈکس مرتب کیا گیا ہے جس سے پتہ چل سکے کہ کس صحابی کی حدیث کہاں کہاں ہے۔

۱۰۔ حوض میں متنِ کتاب ہے اور اس کے نیچے شرح ہے۔ اس طرح وہ دقت دور ہو گئی ہے جو کنارے کے حواشی سے پیش آتی تھی[1]

روض الربیٰ شرح اردو

سنن نسائی کی اردو میں مفصل شرح ہے۔ مولانا وحید الزمان مرحوم (م ۱۳۳۸ھ) نے یہ ترجمہ والا جاہ محی السنہ مولانا نواب صدیق حسن خان رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) کی خواہش پر کیا تھا، جیسا کہ مولانا وحید الزمان مرحوم نے شروع کتاب میں اس کی وضاحت کی ہے[2]۔

امام نسائی کی وفات

۳۰۲ھ میں امام صاحب نے مصر کو خیر باد کہا اور دمشق تشریف لے گئے۔ وہاں خوارج کے ہاتھوں امتحان میں مبتلا ہو گئے۔ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں کسی کو فضیلت ہے۔ انہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کو فضیلت دی۔ اس پر جاہل عوام مشتعل ہو گئے اور آپ پر تشیع کا الزام لگا کر زدوکوب کیا، جس سے امام صاحب نیم جان ہو گئے اور لوگ آپ کو اٹھا کر رملہ لے گئے۔ اور وہاں آپ نے ۳۰۳ھ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ بعض مؤرخین نے ان کا مکہ لے جانا اور بین الصفا والمروہ دفن ہونا بیان کیا ہے۔ لیکن امام دارقطنی نے ان کے رملہ ہی میں دفن ہونے کو ترجیح دی ہے[3]۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۸ سال تھی[4]۔

---

[1] اب تک اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

[2] روض الربیٰ جلد ۱ ص ۸

[3] سیرۃ البخاری ص ۳۳۷

[4] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۵۹

افغانستان میں رُوسی جارحیت کا ایک سال

نعیم صدیقی

آج ۲۶ر دسمبر ہے۔

افغانستانیوں پر روسی جارحیت کی تباہ کاریوں اور جواب میں افغان مجاہدین کے شاندار جہادِ مقاومت کو ایک سال پورا ہوگیا ہے۔ آیئے اس پورے مسئلے پر نظر ڈالیں۔

افغانستان اسلام کے زیرنگیں آنے کے بعد سے اب تک کسی غیر قوم کا غلام نہیں ہوا۔ انگریزوں نے چڑھائیاں کیں اور کئی بار سازشوں سے بھی کام لیا مگر جب قدم آگے بڑھایا تو اپنی افواج کی تباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہر دفعہ یہی تجربہ ہوا کہ اس پتھر کو جونک نہیں لگتی۔ حتیٰ کہ سرحدی علاقے کے قبائلیوں پر بھی تاخت و تاراج کا عمل کامیاب نہ ہوسکا۔ بمشکل خوانین اور سرداروں کو وظیفے دے کر اور بڑی بڑی رقوم قبائل میں تقسیم کر کے اتنا ہی فائدہ حاصل کیا جاسکا کہ آزاد علاقوں کے قبائل برطانوی علاقوں میں حملہ آور نہ ہوں۔ انگریز کو بھی اصل خطرہ روس سے تھا۔ دوسری طرف سے رُوس بھی اہلِ افغانستان اور خصوصاً اپنے قریب کے سرحدی علاقوں میں انگریزوں ہی کی طرح اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے سرگرم رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے علاقہ ہائے نفوذ میں بھی اپنے ایجنٹ چھوڑتے رہے اور ایک دوسرے کے اثر و نفوذ کی کاٹ کرنے کے لیے جوڑ توڑ بھی کرتے رہے۔ عملاً اس قضیے کا حل یہی چلا کہ نہ رُوس افغانستان پر تسلط جمانے کی کوشش کرے اور نہ برطانیہ کوئی ایسی کارروائی کرے بلکہ دونوں اس شرط پر افغانستان سے دوستانہ تعلقات رکھیں کہ افغانستان آزاد، خودمختار اور غیر جانب دار رہے گا۔

برطانیہ جب برصغیر سے رخصت ہوگیا تو حالات میں ایک اہم تبدیلی آگئی ۔ مگر اس کے بعد بھی برطانیہ اور امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک نے افغانستان میں اپنا اتنا اثر برقرار رکھا کہ جس سے وہ خلاء پُر ہوتا رہا جو برصغیر سے برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوجانے کے بعد پیدا ہوا ۔ افغانستان کی آزادی و خود مختاری اور غیر جانب داری برقرار رہی ۔ مگر افغانستان کا قریبی ہمسایہ ہونے کی وجہ سے روس کو اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کا جو خصوصی موقع حاصل تھا، اُس سے اُس نے پورا فائدہ اٹھایا اور دوستانہ معاہدوں اور تعلقات کے پردے میں بڑی ماہرانہ منصوبہ بندی سے اُس نے حکومت اور فوج اور تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ پر اپنی گرفت کو مضبوط کیا ۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سیاسی انقلابات کے ظہور اور حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے کا سررشتہ پوری طرح روس کے ہاتھ میں چلا گیا ۔ ظاہر شاہ کے دور سے جو روسی مداخلت شروع ہوئی وہ کھلی کھلی کمیونسٹ حکومتوں کے قیام پر منتج ہوئی ۔ آخری مہرہ اس وقت ببرک کارمل اس شطرنج کا بادشاہ ہے ۔

مسلسل تجربوں سے جب روس نے سمجھ لیا کہ اس کی قائم کردہ کٹھ پتلی قسم کی حکومتوں کو عوام کی تائید کے بجائے شدید قسم کی مزاحمت کا سامنا ہے تو اس نے جدید ترین بھاری اسلحہ کے ساتھ کثیر التعداد فوج داخل کردی ۔ اکثر گمان کیا جاتا تھا اور خود روس کو بھی شاید یہی خیال ہو کہ افغانستان چھوٹا سا ملک ہے ۔ اور اس کے عوام اسلحہ کے لحاظ سے کمزور، تمدن کے لحاظ سے پس ماندہ اور تعلیمی لحاظ سے بے وزن ہیں لہٰذا افغانستان کی جنگ چار دن کا کھیل ہے ۔ لیکن اس چھوٹے سے ملک کے اُمّی اور نہتے عوام نے ایک عالمی قوت کی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں ۔ روس اور دوسروں کا اندازہ یہ تھا کہ افغانستان میں مزاحمت کا انسداد ہفتے دو ہفتے میں نہ ہوا تو مہینے دو مہینے میں ہو جائے گا، مگر افغان مجاہدین نے تمام ٹائم ٹیبل غلط کر دیئے ہیں ۔

[1] روس کے اشارۂ ابرو سے قائم ہونے اور جلد جلد بدلتی حکومتوں کے بعد افغانستان میں اس کی فوج کے داخل ہو جانے پر مغربی قوتوں کو اپنے مفاد کی فکر ہوئی اور وہ بھونچکے ہو کر عجلت میں متفرق تدبیریں کرنے لگے ۔ امریکہ نے مستقبل کی پیش بندیوں کے لیے سابق شاہ ایران کے ہاتھوں جنگی قوت کا جو بھاری مرکز ایران میں بنوایا تھا وہ امام خمینی کے برپا کردہ انقلاب کے نتیجے میں امریکہ کے ہاتھ سے نکل گیا (باقی بر صفحہ آئندہ)

روس کے ۸۵ ہزار[1] فوجی افسروں اور سپاہیوں نے جدید ترین مشینی اسلحہ اور تباہ کار سامان کے ساتھ ایک کروڑ، ۴۶ لاکھ، ۸۳ ہزار پانچ سو نفوس کی آزاد مملکت پر حملہ کیا۔ یہ مختصر سی آبادی تعلیم، معیشت اور دفاع کے لحاظ سے روس کے مقابلے میں دسویں نمبر پر بھی نہیں آتی۔ مگر روس کو جو جواب ملا ہے وہ یہ ہے:۔

فوجی کارروائی کے بعد دس ماہ کے عرصے میں روس اور کارمل کے ۲۰ ہزار فوجی ہلاک ہوئے، آٹھ سو ٹینک، تین سو ہیلی کاپٹر اور بہت سی بکتر بند گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔

آج بھی افغانستان کی سرزمین کا بڑا حصہ مجاہدین کے قبضے میں ہے۔ روسی جن شہری علاقوں کے "جزیروں" میں پڑے ہیں۔ وہاں بھی اُن پر بار بار اچانک حملے ہوتے ہیں، افسر مارے جاتے ہیں، کئی مرتبہ گولہ بارود کے ذخیروں کو آگ لگائی جا چکی ہے۔ سڑکیں روسیوں کے لیے محفوظ نہیں ہیں۔ کئی پل تباہ ہو چکے ہیں، ایک سے زیادہ بار گیس کی پائپ لائن اُڑائی جا چکی ہے، کابل کے اُس محفوظ علاقے پر بھی مجاہدین نے یلغار کی جو ٹینکوں کی آہنی فصیل سے گھرا رہتا ہے، کارمل کے محل کو آگ لگائی گئی۔ کابل کے شہریوں نے ہڑتال اور مظاہرے کیے۔ یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات نے جانیں خطرے میں ڈال کر روسی قبضے کے خلاف جلوس نکالے۔

مجاہدین کی تعداد ابتداء میں پچاس ہزار تھی۔ اب وہ بڑھ کر ایک لاکھ پچاس ہزار یا اس سے زائد ہے۔ تحریکِ جہاد کمزور ہونے کے بجائے مسلسل زور پکڑ رہی ہے۔ اب جہاد کو عوام نے طریقۂ زندگی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کوئی متبادل صورت موجود نہ تھی۔ اس مقابلے میں امریکہ اور مغربی قوتوں کی ڈپلومیسی کا دیوالیہ پن نمایاں ہو گیا۔ انہیں دس سال پہلے سے اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہونے والا ہے، اور اس کے توڑ کے کیا انتظامات ہونے چاہئیں تھے۔ ضمناً یہ بھی مغربی قوتوں کی کوتاہیٔ تدبیر کا ایک مظاہرہ ہے کہ انہیں ایرانی انقلاب کے بعد کوئی نئی صورت بروقت اختیار کرنے کا راستہ نہیں ملا۔ اب ایک طرف زیادہ تر انحصار خلیجی ریاستوں اور مصر پر کرنا پڑا اور دوسری طرف بھارت کے حق میں غلط بخشیاں ہو رہی ہیں۔

[1] مسٹر حبیب احمد بلخی نے جو ۱۳ ستمبر کو ۲۵۰ ساتھیوں کے افغانستان سے فرار کر کے، اپنے بیان میں بتایا کہ روسی فوج کے سامنے کیوبا، ویت نام، جنوبی یمن اور چیکوسلواکیہ کے ماہرین کو جمع کیا جائے تو افغانستان کے خلاف محاذِ جارحیت ۲ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

سے کے طور پر اپنا لیا ہے۔[1]

میرا خیال تھا کہ اس موقع پر ان بہیمانہ حملوں اور مجرمانہ کارروائیوں کا ذکر کیا جائے جو روس نے افغان عوام کو گولیوں، بموں اور زہریلی گیسوں کا نشانہ بناتے ہوئے کی ہیں اور ان کی لپیٹ میں جنگ سے بے تعلق معذور اور بوڑھے افراد اور عورتوں اور بچوں کی کم سے کم ۵ لاکھ تعداد آ گئی ہے۔ بستیاں کی بستیاں تباہ کر دی ہیں۔ جنیوا کنونشن کے فیصلوں کو بُری طرح پامال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ لیکن فی الوقت اس پہلو سے تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔

اس وقت روس کو نظریاتی محاذ پر پہلی مرتبہ ایک بھرپور شکست ہوئی ہے۔ صدی کی تاریخ میں یہ بڑا عظیم واقعہ ہے۔ اسے انگریزی محاورے کے مطابق "انجام کا آغاز" (BEGINING OF THE END) کہنا چاہیے۔ بھاری بھرکم مست ہاتھی یوں تو گرتے گرتے گرے گا مگر یہ پہلا موقع ہے کہ اسے سونڈ پر کاری ضرب لگی ہے۔

اوّلین پہلو یہ ہے کہ روسی اشتراکیت کے ملحدانہ فلسفہ مادّیت کے لحاظ سے جو کچھ ہو رہا ہے سب مادّے کا کھیل ہے اور مادّی طاقت ہی کشمکش میں فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اس فلسفے کو افغانستان میں فاتح بدر کے بے سروسامانوں نے توڑ کے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے یہ کرشمہ دکھایا ہے کہ ایک کم تعداد اور مادّی لحاظ سے کم تر قبائلی قوم اور کم بلکہ برائے نام ساز و سامان سے لیس متفرق رضاکار سپاہ محض اس بنا پر دنیا کی عظیم عسکری قوت کا منہ پھیر سکتی ہے کہ وہ ایمان اور غیرت کا غیر مادّی جوہر رکھتی ہے۔ ایمان و غیرت کا جوہر نہ ہوتا تو افغانستان بھی ہنگری اور چیکوسلواکیہ کی طرح حریف کے ایک ہی ہلّے میں سر جھکا دیتا۔ ثابت ہو گیا کہ انسان کے پاس مادّی قوت سے زیادہ بڑی قوت بھی موجود ہے اور یہ جب کام کرتی ہے تو تھوڑی سی مادّی قوت کئی گنا زیادہ اثر دکھاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افغانستان کی جنگ مادّے اور ایمان کی جنگ ہے۔ افغانستان نے جرأت و عزیمت کی ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے جس کی وجہ سے روس کی وہ دہشت ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے کوئی سامنے

---

[1] ہر قبیلہ اپنے افراد کی ایک مقررہ تعداد کو برسرِ جہاد رکھتا ہے۔ تین تین ماہ بعد سابق گروپ کو واپس بلا کر نیا گروپ بھیج دیا جاتا ہے۔

کھڑا ہونے کو تیار نہ تھا۔ اور یہ بہت بڑا نقصان ہے جو رُوس کو پہنچا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ ایک جگہ فتح بھی پالے تو بھی اب اُسے دُنیا میں جگہ جگہ مزاحمتیں پیش آئیں گی۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ پولینڈ کے مزدور ڈٹ کر کھڑے ہوگئے ہیں اور انھوں نے بھی سوشلزم کے فلسفے کی اس بنیاد کو باطل کر دیا ہے کہ سوشلسٹ نظام میں مزدوروں کی حکومت ہوتی ہے یا اُن کی فلاح و بہبود کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یا وہ راضی خوشی اس نظام کی گاڑی کے قُلی بنتے ہیں۔[ل]

دوسرا بڑا سانحہ شکست مارکسزم کمیونزم کو یہ پیش آیا ہے کہ اس کے پورے فلسفے کی بنیاد جن دعووں پہ ہے، اُن میں ایک ایسا دعویٰ یکسر ٹوٹ گیا ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکیت کے مادّی نظریے کا ایک ستون چکنا چُور ہو چکا ہے۔

تصوّر یہ تھا کہ "مذہب ایک افیون ہے" یعنی وہ عملی قوتوں کو مفلوج کر دینے والا نظامِ اعتقادات و مرسومات ہے۔ مگر اِدھر عالمِ اسلام میں نصف صدی سے جو اسلامی تحریکیں جدید تمدنی و سماجی شعور کے ساتھ اسلام کے خدا پرستانہ نظامِ حیات کی دعوت لے کے اُٹھی تھیں۔ ان کی انقلابی رُوح اور ان کا مثبت انداز اقدام نظری طور پر اشتراکی فلسفے کا رد تھا۔ رُوس کے عین دروازے پر افغانی قوم مذہبی اسپرٹ کے ساتھ رُوس کے خلاف علمِ جہاد بلند کر کے کھڑی ہو گئی اور محض کھڑی ہی نہیں ہو گئی بلکہ اس نے رُوس کے سرِ پُرغرور کو جھکا دیا۔ ساتھ ہی اسلامی رجحانات کے تحت ایران میں ایک ایسا انقلاب آیا جس کی لہریں بادشاہت کو بہالے گئیں۔ اس طرح نظری حقیقت عملی شکل میں سامنے آ گئی۔ یہ گویا اشتراکیت کے بنیادی فلسفے کا پہلا تنزل ہے جو حال کی تاریخ کے اسٹیج پر اقوامِ عالم کے فرد فرد کو دکھائی دیا ہے۔ تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ باطل فلسفوں کی ایک بار جب بنیاد دہل جاتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ عمارت کے ردّے گرنے لگتے ہیں۔ وقت آتا ہے کہ صرف ملبہ باقی رہ جاتا ہے۔

[ل] حقیقت یہ ہے کہ تمام ممالک جہاں کمیونسٹ حکومتیں قائم ہیں اُن کے مزدوروں اور کسانوں کی محنت سے اصل فائدہ رُوس ہی اُٹھاتا ہے۔ اُن کی سستی محنت سے زرعی خام اجناس بھی حاصل کی جاتی ہیں اور چھوٹے درجے کا صنعتی مال بھی اُن کے ذریعے ارزاں نرخوں پر لیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سے روس کی قیمتی مصنوعات کے لیے کمیونسٹ ممالک بہترین منڈیاں ثابت ہوتے ہیں، بلکہ رُوس کے ماہرین کی گراں بہا خدمات کی فروخت کا بھی یہ بہترین دائرہ ہے۔ یعنی کمیونسٹ رُوس بھی ایک توسیع پسند سامراجی قوت ہے جو مغرب سے بھی زیادہ جبر کیش ہے۔

ایک طرف روس کو نظریاتی محاذ پر اس شکست کا سامنا ہے۔ دوسری طرف عسکری محاذ پر بھی کوئی ایسی فتح حاصل نہیں ہوئی جس کی خوشی کے نشے میں نظریاتی شکست کے زخم کی ٹیسوں سے توجہ ہٹ جائے۔

پھر آس پاس کے علاقوں میں اسلام کے تحریکی ظہور کا اثر روس کے اُن علاقوں پر بھی پڑ رہا ہے جہاں خونریزی کر کے مسلمانوں کو تباہ کیا گیا تھا اور مسلسل کئی سال سے اُن کی برین واشنگ کر کے اُن کے ذہنوں میں ملحدانہ فکر کی پنیری لگائی گئی ہے۔ مسلم لیڈروں، مسلم اساتذہ، مسلم لٹریچر سے محروم علاقوں میں کروڑوں مسلمانوں کو اسلامی عبادات اور اسلامی کلچر سے بیگانہ کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی اسلام کی ایک روحِ بیتاب باقی ہے۔ جیسے کہ پاکستان کے ایک نوجوان دانشور اعجاز گیلانی نے سمرقند، بخارا اور تاشقند کے دورے کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ باوجود سرکاری نگرانی میں کسے ہونے کے، بہت سی باتیں جبریت کے پردوں سے چھن چھن کر سامنے آگئی ہیں، مثلاً بخارا کی ایک بزرگ خاتون کا یہ فقرہ کہ "ہم بھی مسلمان ہیں، مگر ہم پر کفار حکومت کر رہے ہیں" ان احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ افغانستان میں مسلم نسل کے جو سپاہی لائے گئے تھے اُن کو امریکی اور چینی فوجوں کے خلاف لایا گیا تھا۔ مگر جب مقابل میں انہوں نے افغان مسلمانوں کو لڑتے دیکھا تو وہ ڈھیلے پڑ گئے۔ اُلٹا اُنہوں نے افغانستان میں قرآن شریف حاصل کیے۔ ایک تاجیک مسلم سپاہی نے تو فرار کر کے باہر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ کہ مسلم فوجیوں کو واپس کر دیا گیا۔

تازہ ترین خبر یہ ہے کہ روسی صحافیوں کی ایک تعداد نے نہ صرف قبولِ اسلام (یا اظہارِ اسلام) کی جرأت کی بلکہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ مسلم صحافیوں کو الگ منظم ہونے کی اجازت دی جائے، اس پر حکومت چوکنی ہو کر انہیں دبانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس طرح اسلام روس کے لیے ایک وجہ پریشانی بن رہا ہے۔

افغانستان کے ۹۹ فیصد مسلمان یوں تو اپنی جگہ اسلامی عقاید و عبادات اور معاشرتی آداب و شعائر پر قائم تھے، مگر اُن کی اسلامیت ایک متحرک تاریخی قوت کی حیثیت سے نمایاں نہ تھی۔ وہ قبائلی سطح سے آگے نہیں نکل رہے تھے۔ اس کے لیے تو مثبت تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ وہاں کوئی قوت اسلام کی دعوت و تعلیم کو انقلابی شعور کے ساتھ پھیلاتی اور ایک نئی اجتماعیت پیدا کرتی جو قبائلی عصبیتوں سے بالاتر ہوتی، افغانستان میں کام دوسرے راستے سے ہوا۔ یعنی مخالفِ اسلام تبدیلیوں نے افغانوں کے جذبۂ ایمانی کو بیدار کر دیا اور جب وقت کے چیلنج نے پکارا تو وہ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسلامی تحریک کا آغاز ظاہر شاہ کے دور میں ہوا۔ مگر کس طرح؟

ظاہر شاہ کو روسیوں نے آہستہ آہستہ اس حد تک آسیب زدہ کر لیا کہ فوج، انتظامیہ، تعلیمی اداروں میں روس کے ماہرین بھی آ آ کے شامل ہوتے رہے۔ اور روس کے پروردہ کمیونسٹوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہر شعبے میں گھس گئی۔ حتیٰ کہ ادب اور ذرائع ابلاغ پر بھی اس عنصر کا تسلط قائم ہو گیا۔ پشتو اور فارسی، دونوں زبانوں میں ادبی اور نشریاتی میدانوں میں یہی لوگ کام کرنے لگے، روس کی خاص اپنی تعلیم گاہیں بھی قائم ہو گئیں، اور افغان نوجوانوں کو روس کی یونیورسٹیوں میں لے جا کر تعلیم دلانے کا پروگرام بھی اختیار کیا گیا۔ روسی ایڈ بھی آنے لگی۔ اور سفارتی اور ثقافتی دوستی بھی نشوونما پا گئی۔

۱۹۶۶ء میں ظاہر شاہ ہی کے دور میں ایسے "سُرخ" حالات پیدا ہو گئے کہ کابل یونیورسٹی میں نماز ادا کرنا باعثِ عار سمجھنے لگا۔ گویا ملحدانہ کمیونزم کی یلغار خطرے کے نشان سے آگے نکل آئی۔ اس صورتِ حالات میں ایک طرف علماء تھے جن میں بے چینی تو موجود تھی اور وہ اپنے خطبوں میں اشارات و کنایات میں دل کا بخار بھی نکال لیتے لیکن اس سے آگے کوئی قدم اٹھانا ان کے بس میں نہ تھا۔ عوام شعور و حرکت دلانے اور منظم کرنے والی کسی قیادت کے بغیر اپنا پارٹ ادا نہیں کر سکتے تھے۔

اس موقع پر تحریکِ اسلامی کا پہلا سرچشمہ کابل یونیورسٹی ہی سے پھوٹا۔ فیکلٹی آف شریعہ کے چیئرمین غلام محمد نیازی تھے، جو بہ حیثیت استاد اپنی مشکلات کے باوجود طلبہ میں اسلامی روح پھونکنے کا کام کر رہے تھے۔ ان کے زیرِ سایہ ایک نوجوان طالب علم عبدالرحیم نیازی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پابندیوں اور تشدد کے باوجود کھل کر اسلام کے لیے کام کیا۔ اور متعدد نوجوان طلبہ اس کے گرد جمع ہو گئے جن میں سے زندہ اصحاب موجودہ تحریک کی قیادت کر رہے ہیں۔ اساتذہ میں سے سیاف اور ربانی بھی اسلامی تحریک سے متعلق تھے۔ فیکلٹی کے چیئرمین غلام محمد نیازی کو حوالۂ زنداں کیا گیا اور انہیں جیل ہی میں شہید کر دیا گیا۔ نوجوان طالب علم لیڈر عبدالرحیم نیازی کو شدید علالت کی حالت میں علاج کے لیے دہلی لایا گیا اور یہاں سے اس کی لاش واپس کی گئی۔ حکومت کی طرف سے بتایا یہ گیا کہ خون کا سرطان تھا، مگر بعد میں یہ چہ میگوئیاں پھیل گئیں کہ عبدالرحیم کی شہادت زہر خورانی کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ اساتذہ میں سے مولوی عبدالرحمٰن بھی شہید کر دیے گئے۔

عبدالرحیم نیازی کے بعد ۵ افراد کی ایک کمیٹی بنی، جس نے سید قطب شہید اور مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کے بل پہ تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان پانچ میں سے انجینئر حبیب الرحمٰن (جنہوں نے سردار داؤد کے زمانے میں

مولانا مودودیؒ سے ملاقات کی تھی) انجینئر سیف الدین، ڈاکٹر محمد عمر، عبدالمقادر چار اصحاب کو ختم کر دیا گیا۔ صرف ایک پانچویں رکن گلبدین حکمت یار زندہ ہیں۔ یہ تمام کے تمام اُس زمانے میں طالب علم تھے۔

دوسری طرف نوجوان طلبہ کے حرکت میں آنے کی وجہ سے علماء کے گروپ نے بھی کروٹ لی ظاہر شاہ کے دور میں تو یہ دھیمے اور گھٹے ہوئے انداز سے کام کرتے رہے۔ مگر سردار داؤد کے زمانے میں کھل کر میدان میں آ گئے۔

ایک راوی ثقہ نے مجھے بتایا کہ ظاہر شاہ کے آخری دور میں تحریک اسلامی کے ۲۵ نمائندوں کی ایک خفیہ میٹنگ کابل سے کچھ دور ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ حالات کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب ان میں سے صرف ۷ زندہ ہیں۔

بات کہیں سے کہیں نکل جائے گی یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ مسلم نوجوان طلبہ کی تحریک نے کیمونزم کے خلاف اتنی بیزاری پیدا کر دی کہ ۱۹۷۲ء میں اسلام پسند نوجوانوں نے تعلیمی اداروں میں الیکشن جیت لیے حتیٰ کہ عین روسی پالی ٹیکنیکل یونیورسٹی میں روس کے صدر پوڈگورنی کے دورہ کابل کے وقت آگاہ کر دیا گیا کہ وہ اس یونیورسٹی میں داخل نہیں ہو سکتے۔

اس مختصر جائزہ احوال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ تحریکِ جہاد کا پس منظر کیا ہے اور اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

برزنیف صاحب نے بھی حالیہ دورۂ بھارت کے دوران میں یہ اقرار تو کر لیا کہ افغانستان میں حالات بہت خراب ہیں۔ تو پھر یہ کہنا کہ چند ڈاکوؤں اور لٹیروں نے ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ کیسے معقول ہو سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر ایک ملک کے اکثر و بیشتر حصے میں روس اور اس کی فوج اور کارمل حکومت کے خلاف تند و تیز جذبات پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں کسی روسی کا داخل ہونا ممکن نہیں اور جہاں کارمل حکومت کا ذرہ بھر اثر نہیں۔ تو پھر اس ملک کے وہ کونسے عوام ہیں جنہوں نے آپ کو بلایا تھا یا جن کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لئے حکومت افغانستان نے آپکو دعوت تکلیف دی تھی؟

عوام میں سے ۱۳ لاکھ افراد پاکستان میں ترکِ وطن کر کے پڑے ہیں۔ ۲ لاکھ ایران میں ہیں۔ ۵ لاکھ افراد کو روسی کارمل کارروائیوں نے ختم کر دیا ہے (ایک دوسری رپورٹ کے لحاظ سے یہ تعداد دس لاکھ ہے ۱½ لاکھ مجاہدین برسر پیکار ہیں۔ یورپ، مشرق وسطیٰ، ہندوستان اور امریکہ میں پناہ گزین مہاجرین کی تعداد

۲ لاکھ ہے۔ اس تعداد کا ایک حصہ تعلیم اور ملازمت کے لئے پہلے سے باہر موجود تھا۔ اس طرح تقریباً کل آبادی میں سے شہید ہونے والوں سمیت ۲۲ لاکھ افراد تو صریحاً مخالف جانب کے ہوئے۔ باقی ۱/۲ ۱ کروڑ سے کچھ کم تعداد رہ جاتی ہے۔ اس تعداد میں سے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی تعداد الگ کر دی جائے تو مردانِ کار کا تناسب ۵/۱ ملحوظ رکھتے ہوئے کل تعداد ۱/۲ ۲۸ لاکھ سے قدرے زائد بنتی ہے۔ کیا آپ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ۱/۲ ۲۸ لاکھ عوام آپ کے ساتھ ہیں؟ ان ۱/۲ ۲۸ لاکھ میں سے اگر چوتھا حصہ بھی نام نہاد "ڈاکوؤں لیٹروں" کی صرف ۱/۲ ۱ لاکھ تعداد کے مقابلے پر آ جاتا تو بغیر کسی خارجی سپاہ اور سامان کی مدد کے فقط ایک ہفتے میں سب کا صفایا کر سکتا ہے۔ اتنی بڑی تعداد (اور اس میں جوان عورتوں اور بوڑھوں بچوں کی جزوی مدد بھی شامل کی جا سکتی ہے) اگر "ڈاکوؤں لیٹروں" کو اپنی آبادیوں اور وادیوں یا پہاڑوں میں گھسنے نہ دے یا ان کی مخبری کرنے ہی پر تل جائے تو قصہ ختم ہو سکتا ہے۔ مجاہدین اور دوسرے عوام کا تناسب ۱:۸ یا ۱:۹ کا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ قوت آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ تعداد براہ راست خود جنگ کرے یا نہ کرے، اس کی ساری حمایت و ہمدردی مجاہدین آزادی کے ساتھ ہے۔ دیہی آبادی میں معمول یہ ہے کہ مجاہدین جہاں جائیں ان کو پناہ دینا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا یا ان کی راہنمائی کرنا اور دشمن کے متعلق اطلاعات دینا سب کے لئے ایک لازمی امر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجاہدین ایک ماہ بھی نہ لڑ سکتے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ کابل حکومت کی افغانی فوج کے دستے اور بریگیڈ اور ڈویژن وقتاً فوقتاً مجاہدین سے جا ملتے ہیں پھر دنیا بھر نے دیکھ لیا کہ یونیورسٹیوں کے نوجوانوں اور شہروں کے دوکاندار مجاہدین سے گہری ہمدردی کا اظہار ہڑتالوں اور مظاہروں کی صورت میں کرتے رہے ہیں اور جانی اور مالی نقصان بھی اٹھاتے رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کابل حکومت کے افسران اور ملازمین بھی چار و ناچار وقت گزار رہے ہیں۔ ورنہ ان کی دلی حمایت بھی مجاہدین ہی کے لئے ہے اور روسی تسلط سے بیزار ہیں۔ اس کے شواہد ملاحظہ ہوں۔

۱۔ افغانستان کی قومی ائیر لائن ائیریانا کا چیف پائلٹ مسٹر حبیب اللہ بلخی ۲۵۰ ساتھیوں کے ہمراہ ایک خفیہ اسکیم کے تحت (جو مئی سے شروع کی گئی تھی) ۱۴ ستمبر کو روس کے تسلط سے نکل بھاگا اور فرینکفرٹ پہنچ کر ان لوگوں نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ افغانستان میں روس کے فوجی اقدام کے خلاف مزاحمت بڑھ رہی ہے۔ اور یہ کہ افغان مجاہدین آزادی کیلئے آخری سانس تک لڑیں گے۔

۲۔ کابل حکومت کی طرف سے محمد اختر پکتیوال کو یونیسکو کے ۲۱ ویں اجلاس میں نمائندگی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اور اس اجلاس میں میبکر آئیڈ رپورٹ بہ سلسلہ آزادی مخابرات پر غور ہونا تھا۔ ملک سے باہر جا کر محمد اختر نے کابل حکومت سے تعلق ختم کرنے کا اعلان کیا اور مغربی جرمنی میں سیاسی پناہ طلب کی۔ محمد اختر نے پریس انٹرویو میں بتایا

کہ کسی محب وطن کے لئے افغانستان کی صورتِ حالات قابلِ قبول نہیں۔ ۹۰ فیصد افغانی روس کی پٹھو حکومت کے خلاف ہیں۔ کابل کے مرکزی جیل خانے میں ۶ ہزار دانشور، طلبہ، اہلِ علم اور تاجر موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ اختر صاحب کا اندازہ ہے کہ روس کے آنے کے بعد سے اب تک کل دس لاکھ افراد کا خاتمہ کیا جا چکا ہے۔ ہمہ اختر نے بڑے کرب سے بتایا کہ انہوں نے اپنے دوستوں اور رفیقوں کو فوجی دستوں کے ہاتھوں گولیاں کھاتے دیکھا ہے۔

۳۔ ابھی ابھی کابل حکومت کی وزارتِ خارجہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر غفور زئی کو غیر جانبدار تحریک کے اجلاس میں شرکت کے لئے حکومت کے نمائندے کے طور پر یورپ بھیجا گیا تھا۔ موصوف نے بجائے حکومت کی نمائندگی کے بھرے اجلاس میں اپنی قوم کی مظلومیت کا دکھڑا رویا۔ روسی جارحیت کا پول کھولا، اجلاس ہی میں حکومت سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا اور سیاسی پناہ حاصل کر لی۔

۴۔ اس سے پہلے متعدد کھلاڑیوں کا ایک گروہ کابل حکومت کے پنجرے سے نکل بھاگا۔

اس قسم کے شواہد کسی بھی ملک کی حقیقی صورتِ حالات کو دنیا بھر کے سامنے واضح کر دینے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ لاکھوں افراد کا اجڑ پچھڑ کر اور زخمی ہو ہو کر کسی ملک سے نکل کھڑے ہونا اس امر کا اشتہار و اعلان ہوتا ہے کہ وہاں جبر و ظلم کی تلوار چل رہی ہے۔ کیونکہ ترکِ وطن، حالات کے بدترین صورت اختیار کرنے سے پہلے نہیں ہوتا۔ جہاں تک ممکن ہو، انسان گھر اور وطن میں رہ کر ظلم سہتا رہتا ہے۔ ہجرت تو آخری چارۂ کار ہے، ظلم اور درندگی کے خلاف عملی صدائے احتجاج۔ اس سے بڑا پروٹسٹ کیا ہو گا کہ ۱۲ لاکھ مہاجرین پاکستان میں اور ۲ لاکھ ایران میں اور ۱ لاکھ دوسرے ممالک میں مصائب بھگت رہے ہیں۔ روسی جارحیت کے خلاف یہ ایسا خاموش مظاہرہ ہے کہ کوئی پروپیگنڈہ اور ڈپلومیٹک بیان بازی اس کا توڑ کرنے کے قابل نہیں۔

سوال یہ ہے کہ افغانستان کے جن عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی حفاظت کے لئے کابل کی کمیونسٹ حکومت نے روس سے فوجی مدد مانگی ہے۔ آخر ان کے دستے کیوں مہاجرین کے خلاف جا بجا لڑتے دکھائی نہیں دیتے۔ سرکاری فوج کی کم ہوتی ہوئی تعداد بھی وفادار اور قابلِ اعتماد نہیں رہی۔ یہاں تک کہ ببرک کارمل صاحب نے جبری بھرتی کی، اسکیمیں بھی چلائیں اور فوجی ملازمت کے لئے حدِ عمر، حدِ تعلیم اور دیگر شرائط نرم کر دیں۔ نیز تنخواہوں اور مفادات کا پیمانہ بڑھا دیا۔ پھر بھی فوج کی وہ تعداد پوری نہیں ہو رہی جو روسی فوج کے

داخل ہونے کے وقت تھی۔ آخر وہ کابلی عوام ہیں کہاں جن کی حفاظت کے نام پر سارا خون خرابہ ہو رہا ہے۔ روس کے سامراجی پروپیگنڈے کے بہترین ماہرین بھی ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔

روس کی ایک ہی رٹ ہے ـــــ بیرونی مداخلت!

یعنی اندر تو سب خیر ہے، عوام روسی جارحیت کے تحت ہر دن کو عید اور ہر شب کو شب برات جانتے ہیں۔ سارا قضیہ تو ایران، چین اور پاکستان کی مداخلت کی وجہ سے ہے۔

اچھا تو فرمائیے کہ ایران نے کتنے بریگیڈ داخل کیے ہیں۔ پاکستان کے کتنے آرمرڈ ڈویژن افغانستان میں لڑ رہے ہیں، اور چین سے کس تعداد میں گوریلا فورس وہاں پہنچ گئی ہے۔ کیا مداخلت کار غیر ملکی فوجیوں کی تعداد ۸۰ لاکھ سے زیادہ ہے اور سامانِ جنگ روس سے زیادہ جدید اور بھاری؟ ان مداخلت کاروں کو آپ ختم کیوں نہیں کر سکے؟ ان کے راستوں کی ناکہ بندی کیوں نہ ہو سکی، دیدبانی کا انتظام کیوں نہیں، اُن کی کتنی نعشوں اور کتنے قیدیوں کی تصاویر آپ عالمی پریس کے سامنے لا سکے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہیں تو فرمائیے ناں کہ آیا ان ممالک سے جنات کی فوجیں بھیجی جاتی ہیں؟ اور ذرا اس اسلحہ کی بھی نمائش لگا کر عالمی پریس اور فوٹو گرافروں کو ملاحظہ کرا دیجیے، جو بیرونی مداخلت کاروں سے چھینا گیا ہو؟ کتنا اس میں سے چین کا ساختہ ہے، کتنے پر پاکستانی مہر ہے؟ اور کتنا کسی دوسرے ملک کا ہے؟

پاکستان نے مختلف بین الاقوامی اکابر اور وفود کو مہاجر کیمپوں کا تفصیلی معائنہ کرا کے دکھا دیا ہے کہ کہیں نہ تو کوئی تربیتی کیمپ ہے، نہ سامانِ جنگ کا ڈپو، نہ کوئی بھرتی کا دفتر، مگر روسی پروپیگنڈے کی ایک ہی رٹ چلی جا رہی ہے۔

ایک دعویٰ روس کا ہے، دوسرا افغانستان کے مجاہدین کا ـــــ دیکھنا یہ ہے کہ ساری دنیا جن کی نگاہیں ایک سال سے افغانستان پر مرتکز ہیں، وہ دونوں میں سے کس کے ساتھ ہے۔ ایک پلیٹ فارم اقوام متحدہ کا ہے، دوسرا غیر جانب دار ممالک کا، اور تیسرا اسلامی ممالک کا۔ ان تینوں کی بھاری اکثریت نے روس کے دعووں کو باطل گردانا ہے اور افغانستان کے مجاہدین کے دعوے کی توثیق کی ہے۔ عالمی رائے کی عدالت نے جب ایک واضح فیصلہ دے دیا ہے تو پھر ساری نکتہ آفرینیاں بے کار ہیں۔ روس کو سیدھی طرح سے اپنی جارحانہ کارروائی کے جرم کا اعتراف کرنا چاہیے۔ فوجیں فوری طور پر واپس بلا لینی چاہئیں اور باشندگانِ افغانستان کو کھلا موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے جیسی اور جس کی حکومت

چاہتے ہوں قائم کرلیں۔

اس وقت روس افغانستان کی چٹانوں میں پھنسی ہوئی اپنی دُم کو صحیح سلامت نکال لے جانے کے لیے کسی ایسی حکومت کے قیام کا راستہ نکالنا چاہتا ہے جو اُس کی کٹھ پتلی بن کر بھی رہے اور افغان عوام کو ٹھنڈا کرنے کا کامیاب ذریعہ بھی ثابت ہو۔ دوسری طرف مغربی ممالک کو بھی اپنے مفاد کے لیے جس طرح روس کا افغانستان پر قبضہ گوارا نہیں اُسی طرح یہ بھی پسند نہیں کہ افغانستان کی تحریک جہاد کی فراہم کردہ قیادت کے ہاتھوں اسلامی حکومت کی کوئی شکل قائم ہو۔ مغرب والوں کو اگر دو ملاؤں میں سے ایک کے انتخاب کے سوا کوئی اور راستہ نہ ملے تو وہ کسی طرح کی اسلامی حکومت کے مقابلے میں لادین کمیونسٹ حکومت کو ترجیح دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف مغربی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ مجاہدین روس کی زیادہ سے زیادہ مزاحمت کریں اور اُس کے قدم نہ لگنے دیں، اور اُن کے ہاتھوں سے روس کی قوت اور ساکھ کو نقصان پہنچے۔ اپنی اس خواہش کے تحت وہ عالمی رائے عام کی مخالفِ روس فضا کو مؤثر بنائے رکھنے کے لیے پروپیگنڈے کی توپیں استعمال کر رہے ہیں، نیز مہاجرین کو یورپ، برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے پاکستان میں کچھ نہ کچھ امداد ملتی رہتی ہے۔ دوسری طرف ان کی چھپی ہوئی خواہش یہ ہے کہ تحفظ ایمان و آزادی کے جس معرکے میں والہانہ طور سے قربانیاں دے رہے ہیں، اُس کی وجہ سے اُن کی افرادی قوت زیادہ سے زیادہ تباہ ہو جائے، نیز اُن کی رہی سہی قوت کو افتراق انگیزی سے اتنا نقصان پہنچا دیا جائے کہ وہ بے دم ہو کر ایک ایسے درمیانی حل کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں جس پر روس اور مغرب دونوں بھی راضی ہوں۔ اس طرح تین مقاصد حاصل ہوتے ہیں:۔

اولاً روس کی واپسی، ثانیاً مہاجرین افغانستان کی قوت کی کمی، ثالثاً غلبۂ اسلام کے خطرے کا انسداد۔

یہی باعث ہے کہ وہ عملاً مہاجرین کی کوئی ٹھوس امداد نہیں کرسکے۔ انہوں نے روس کے خلاف غلّے، مصنوعات اور ٹیکنالوجی کی بہم رسانی پر جو جزوی پابندیاں لگائی تھیں، اُن کو بھی نبھایا نہ جا سکا۔ بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ ہماری مغربی سرمایے، مغربی غلّے، مغربی مصنوعات اور مغربی ٹیکنالوجی کا بہت بڑا حصّہ روسی جارحیت میں شامل ہے اور درحقیقت روس کے ساتھ بالواسطہ طور پر مغربی قوتیں بھی افغانیوں کے خلاف ہونے والی جنگ میں حصّہ دار رہیں۔ افغانیوں کے لیے اُن کا جذبۂ ہمدردی اتنا کمزور تھا کہ اولمپک گیمز میں عدم شرکت کے جس علامتی اظہارِ بیزاری کا فیصلہ کیا گیا تھا، وہ بھی ناکام ہو گیا۔ ان باتوں سے اُس نیم دلی کا اندازہ ہوسکتا ہے جو مغرب والوں کی ہمدردیٔ افغانستان میں پائی جاتی ہے۔

مغرب والے ایک تیسرا کام بھی مغالطہ انداز سے کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ اُن کی طرف سے یہ پروپیگنڈا بھی ہے کہ تحریک مجاہدین کے پاس کوئی قیادت نہیں ہے جو کامیابی کی صورت میں ملک کا نظام چلا سکے اور ہو بھی تو مجاہدین ایک شدید ترین مخالف قوت کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے عالم میں بھی پوری طرح متحد نہیں ہیں، وہ اگر موجودہ آزمائش میں سے کامیاب ہو کر نکلیں بھی تو آپس میں دست و گریباں ہو جائیں گے، لہٰذا ملک کی تقدیر سنور نہ سکے گی۔ اس سے آگے یہ حرکت بھی کی جا رہی ہے کہ چھوٹی چھوٹی فرضی تنظیموں کے نام اُچھالے جاتے ہیں۔ اور اُن کے حوالے سے ناقابلِ حل اختلافات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس دھیمے پروپیگنڈے کو ایران کے داخلی احوال کی وجہ سے بھی تقویت مل رہی ہے۔

خیال رہے کہ عالمی پروپیگنڈے کی مغربی مشینری میں یہود کی قوت کو بڑا دخل ہے جو ہر خطے کے مسلمانوں کے خلاف فضا بناتے ہیں بلکہ خود مسلمانوں میں افتراق پھیلانے کے حربوں سے کام لیتے ہیں۔

آئیے سوچیں کہ مستقبل کی حکومت کے لیے کیا امکانات ہیں۔

ایک بات روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے وہ یہ کہ افغانستان ایک مجاہدانہ تحریک اور اس کے عوام کی بے پناہ قربانیوں کے دور سے گذرنے کے بعد اب ویسا افغانستان نہیں رہا کہ اُس پر قرونِ وسطیٰ کے طرز کی کوئی بادشاہت چل سکے۔ ظاہر شاہ بھی اس حقیقت کو سمجھتا ہے اور دونوں طرف سے اُسے ٹٹولنے والوں کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ افغانستان کے تخت و تاج کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے۔ مغربی ممالک اب جس بات کے درپے ہیں وہ یہ ہے کہ ظاہر شاہ یا سردار داؤد کے زمانے کے کچھ وزراء و سفراء کو بعض مذہبی شخصیتوں کے سہارے کھڑا کیا جائے اور ایک ایسی حکومت قائم کر دی جائے جو روس کے لیے بھی قابلِ قبول ہو۔

پردہ ہائے راز سے چھن چھنا کر جن لوگوں کے چہروں کی دھندلی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان میں سے ایک سردار ولی ہیں جو اس معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہے ہیں۔ دوسری شخصیت سابق وزیراعظم ڈاکٹر محمد یوسف کی ہے جو ختم شدہ شاہی خاندان کے ایک مہرے کی حیثیت سے جوڑ توڑ کی مہم میں لگے ہیں۔

لیکن ایسے تمام جوڑ توڑ ناکام ہوں گے۔ کیونکہ تحریک مجاہدین کی اپنی قیادت اُبھر آئی ہے۔ اور تمام افغان جہاد کے لیڈروں کے گرد جمع ہیں۔ نیز یہ بات عوام یعنی مجاہدین اور اُن کے

معاونین کو بھی معلوم ہے اور ان کے لیڈر بھی اس کا شعور رکھتے ہیں کہ اتنی بھاری قربانیاں دینے کے بعد اگر اسلامی نظام کے قیام کو مؤخر کر کے کسی سیکولر حکمران کو قبول کر لیا گیا تو پھر حالات کے بگاڑ پر دوبارہ اس درجے کی تحریک نہ اٹھائی جا سکے گی۔ وہ انسانی خون کے قطروں اور انسانی سروں اور لاشوں کی بوئی ہوئی فصل کو کسی غیر اسلامی قوت کے حوالے نہیں کر سکتے۔

دراصل افغانستان میں روس کی مزاحمت کوئی پولٹیکل پارٹی نہیں کر رہی یا پارٹیوں کا کوئی متحدہ انتخابی محاذ مہم نہیں چلا رہا کہ سودا بازی اور جوڑ توڑ سے کام بن جائے۔ وہاں تو گاؤں گاؤں قریہ قریہ میں تحریک جہاد چل رہی ہے۔ اب جو اصحاب اس تحریک کے لیڈر ہیں، افغانستان کا مستقبل انہی سے وابستہ ہے۔ باہر کا کوئی آدمی عوام اور مجاہدین کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

مختلف قبائلی حلقوں میں سب سے زیادہ اثر حزب اسلامی افغانستان، جمعیت اسلامی افغانستان اور حرکتِ اسلامی افغانستان کو حاصل ہے۔ ایک اہم قوت پروفیسر عبدالرسول سیاف جیسی محترم شخصیت کا قائم کردہ "اتحاد اسلامی برائے آزادئ افغانستان" ہے۔ ان تنظیموں کے ممتاز قائدین، پروفیسر سیاف، انجینئر گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، محمد یونس خالص، مولوی محمد نبی، مولوی نصر اللہ ہیں۔ حالات کے دھارے کو یہ حضرات جدھر چاہیں، موڑ سکتے ہیں۔ ان میں سے بھی ہمارا اندازہ یہ ہے کہ جس امر پر پروفیسر سیاف، انجینئر گلبدین حکمت یار اور برہان الدین ربانی متفق ہو جائیں۔ دوسرے تمام لیڈر اور گروہ ان کا ساتھ دیں گے — ماسوا کسی ایسے فرد یا گروہ کے جو کسی بیرونی قوت کے زیر اثر ہو۔

اہلِ مغرب کی پروپیگنڈا مشینری تحریک مجاہدین کے ان لیڈروں کی قیادت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اور نہ ان کو ویسی اہمیت دی جاتی ہے جس کے یہ مستحق ہیں۔ انہیں تسلیم کرنے سے مغربی ذہن اس لیے بھی کسمساتا ہے کہ ان کی قیادت ماننے کے بعد کچھ خاص ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں، نیز تحریک مجاہدین کو ایک اتفاقی، جذباتی، جنونی، منفی اور دفاعی حرکت سے کچھ زیادہ ماننا پڑتا ہے۔

فی الحقیقت افغان عوام اور خاص طور پر ان کے لیڈروں کے لیے بہت بڑے امتحان کا یہ موقع ہے جس میں اگر خدانخواستہ وہ فیل ہو گئے، تو آج قربانیوں کے نتیجے میں جو امکانات

اُن کو مل رہے ہیں، وہ دوبارہ مدتوں تک نہ ملیں گے، بلکہ آگے چل کر جو روس نواز حکومت قائم ہو گی وہ آج کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا اُن سے خوفناک انتقام لے گی۔ اگر خدا ایک ہے جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہیں، اگر قرآن اور قبلہ ایک ہے تو اُمتِ محمدیہ جس خطے میں بھی ہو، ایک ہے۔ قبیلے اور برادریاں اور علاقے اور زبانیں اور رنگ یہ سب کچھ وحدت کے دائرے کے اندر آتا ہے۔ جو لوگ اسلام کا نام لے کر جدوجہد کر رہے ہوں انہیں اسلام کے تقاضائے وحدت کو پورا کرنا چاہیے، اور فیصلے کا وقت آنے سے پہلے پورا کرنا چاہیے۔

ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ تمام تنظیمی گروہوں کے لیڈر مل کر مستقبل کی حکومت کا ایک مختصر (دس بارہ نکاتی) منشور مرتب کریں۔ اور اس پر سب دستخط کر کے اتحادِ کامل کا مظاہرہ کریں، بلکہ تحریکِ جہاد کو چلانے کے لیے بھی ایک مجلسِ قیادت کا واحد امیر مقرر کر کے سو فیصدی انقیاد و اطاعت کا ایسا نمونہ پیش کر دیں کہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی کمر ٹوٹ جائے اور افتراق کی اُمید لگانے والے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں۔ جانیں قربان کر دینے سے مشکل کام اپنی اپنی لیڈری اور اپنے اپنے مفاد اور اپنے اپنے اختلافات کو ختم کر دینا ہے، مگر اس کے لیے عزم راسخ ہو تو یہ بالکل آسان بھی ہے۔

وحدت و اتحاد کے معنی یہ بھی نہیں کہ نظریاتی اور مقصدی طور پر تضاد و اختلاف رکھنے والے اشخاص اور گروہوں کو بھی کسی نہ کسی طرح گھسیٹ کر اپنی صفوں میں لا کھڑا کیا جائے، جن لوگوں کے دل و دماغ اُلٹے ہوں، وہ کسی مقصد کے علمبرداروں کے ساتھ شامل ہو جائیں تو ہر اہم موڑ پر وہ مصیبت کھڑی کر دیتے ہیں۔ سو نظریہ و مقصد کے لحاظ سے جن کا مزاج دوسرا ہو اُن کو الگ ہی رہنے دیا جائے، ایسے لوگ اور کامل اتحاد قائم ہونے میں رخنہ اندازی کرنے والے تخریبی مزاج کے عناصر عوام کے سامنے از خود بے نقاب ہو جائیں گے۔ اور اُن کی کوئی مغالطہ انگیزی چل نہ سکے گی۔

بہر حال اصل دارو مدار تحریکِ مجاہدین کے اکابر پر ہے کہ وہ اس تحریک کی قربانیوں کے نتیجے میں اسلامی نظام حاصل کرنا چاہتے ہیں یا ان قربانیوں کو رائیگاں جانے دینے کا سبب بنتے ہیں۔

دیکھیے اب کمبل سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتا ہے، مگر کمبل چھوڑتا نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ روس قضیے کے "سیاسی حل" کی بڑی اُلٹی صورت سامنے رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ لوگ کان کو ہاتھ

بھی لگائیں اور لگائیں بھی گردن کے پیچھے سے ہاتھ کو گھما کر۔

اس کا مطالبہ یہ ہے کہ متصلہ ممالک یعنی پاکستان اور ایران (جنہیں وہ افغانستان میں مداخلت کا مجرم گردانتا ہے) کابل حکومت سے بات چیت کریں۔ یہ مطالبہ اس لئے بے تکا ہے کہ کابل حکومت تو صریحاً پٹھو حکومت ہے۔ روس کی بنائی ہوئی حکومت، روس کا بٹھایا ہوا حکمران، روس کے ماہرین کے زیر اثر ساری انتظامیہ، روس کی فوجی عملداری، روس کی بنائی ہوئی داخلہ اور خارجہ پالیسیاں اور افغان عوام کی جانوں، بستیوں، کھیتیوں اور عزتوں کی تباہی روس کے اشارۂ ابرو سے، پھر آخر روس اپنی اس تھیٹری حکومت کی ذمہ داری خود کیوں نہیں لیتا۔ وہ خود براہ راست بات چیت کرے۔ خود پاکستانی اور ایرانی حکمرانوں کے مشورے سے سیاسی حل نکالے۔ ورنہ پاکستان اور ایران بھاری روسی فوج کی موجودگی میں زیر جنگ اور زیر تباہی مملکت افغانستان کے بارے میں ببرک کارمل کی پٹھو حکومت سے بات کر کے اسے سندِ جواز کیسے دیں۔ اس نکتے کا بھی تو حل ہونا چاہیئے۔

ببرک کارمل کو الگ چھوڑ کر بین الاقوامی سطح کا ایک غیر جانبدار کمیشن مقرر کیا جاسکتا ہے، کوئی مختصر ثالثی کمیٹی اقوام متحدہ یا غیر جانبدار ملکوں کی طرف سے مامور کی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہو تو ببرک کارمل صاحب کی نمائندگی بھارت کی اندرا کرسکتی ہیں۔ غرضیکہ کئی صورتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس نے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کو روس سیاسی حل کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ آخر ببرک کارمل کا حوالہ کیوں ضروری ہے۔ ببرک کارمل اور ان کی حکومت کو مجاہدین افغانستان کسی صورت تسلیم یا قبول نہیں کرسکتے۔ پھر کسی ایسے حل سے کیا حاصل جو قضیے کے ایک بڑے فریق —— بلکہ سب سے بڑے فریق —— کے لئے قابلِ قبول نہ ہو۔

پیشِ نظر جھگڑے میں اس مغربی ضرب المثل کو داخل نہ کیجئے گا کہ "مجھے پیار کرنا ہو تو میرے کتے سے بھی پیار کرو"۔

رسائل و مسائل

قصص سلیمانؑ و یوسفؑ کے بعض اشکالات

جناب ملک غلام علی صاحب ۔ منصورہ

سوال :۔ درج ذیل اشکالات پیش کر کے رہنمائی کا طالب ہوں۔ امید ہے جواب سے نوازیں گے
۱۔ سورۃ السبا کی آیت نمبر ۱۴ کا ترجمہ تفہیم میں یوں ہے۔ "پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز، اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔" اس آیت کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۲۴ پر مولانا مغفور نے زمانۂ جدید کے ان مفسرین کی رائے سے اختلاف فرمایا ہے جو یہ تاویل کرتے کرتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت سلیمانؑ کا بیٹا رجعام ہے جو انتہائی نالائق ہونے کی وجہ سے اپنے جلیل القدر والدِ گرامی کی عظیم الشان سلطنت کو نہ سنبھال سکا اور اس کی جانشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس سلطنت کا قصر دھڑام سے زمین پر آرہا۔" یہاں مولانا نے زبردست عقلی دلائل سے اس تاویل کو رَد کرتے ہوئے اس کیفیت کو صورتِ واقعہ قرار دیا ہے جو آیت کے ترجمے سے مترشح ہوتی ہے۔ بادی النظر میں ایک قاری اس عقلی استدلال سے واقعی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن ذرا غور کرنے پر یہی عقل ایک سوال سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ کا ایک برگزیدہ نبی اور ایک عظیم الشان سلطنت کا بادشاہ اپنے تمام کارہائے نبوت اور انتظاماتِ ملکی ترک کر کے

ایک قصر کی تعمیر و نگرانی میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کی بے پایاں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی - اور پھر بھی لوگ اس غیر فطری صورتِ حال سے نہیں چونکتے ؟ بے شک ذمہ داریوں کی حد تک یہ توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنا کوئی نائب مقرر کر کے فراغ حاصل کر لیا ہوگا - لیکن اس پہلو کی تشنگی کیسے بجھے گی کہ ایک معروف ترین اور جلال و شکوہ کا پیکر انسان اچانک ایک دن تمام ذمہ داریاں تج کر ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے ، نہ وہ لیٹتا ہے ، نہ سوتا ہے ، نہ کچھ کھاتا ہے ، نہ پیتا ہے ، نہ اُسے حوائج ضروریہ لاحق ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ ہلتا جُلتا نہیں ہے - اور یہ کیفیت دو چار لمحے کے لیے نہیں بلکہ ہفتوں یہی صورت برقرار رہتی ہے - اور رعیت کے کسی انسان یا جن کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ موصوف زندہ ہے یا مُردہ - ظاہر ہے کہ سیدنا سلیمان کی وفات سے لے کر عصا کو گھن لگ کر گرنے میں کم از کم ہفتوں کا وقفہ درمیان رہا ہوگا ایسی عظیم ہستی کے تو چند گھنٹے بھی خلاف معمول گزرنے مستبعد نظر آتے ہیں کجا کہ ہفتے ، مہینے - آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے براہ کرم وضاحت فرمائیں -

۲ - سورہ الیوسف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی حصول اناج کے لیے مصر آتے ہیں تو سیدنا یوسفؑ تو انہیں پہچان جاتے ہیں ، لیکن برادرانِ یوسفؑ آنجناب کو نہیں پہچان پاتے - اور حضرت یوسفؑ اُن کے علم میں لائے بغیر ان کے اناج کے توڑوں میں وہ پونجی بھی رکھوا دیتے ہیں جس کے عوض میں وہ حضرات اناج حاصل کر کے لے جا رہے ہیں - برادرانِ یوسفؑ اپنے مستقر پہ پہنچ کر جب اناج کے بوجھے کھولتے ہیں تو اُن میں اپنی پونجی بھی موجود پاتے ہیں - اور خوش ہو کر اپنے والد گرامی حضرت یعقوبؑ سے کہتے ہیں کہ " اے ابا جان ! ہمیں اور کیا چاہیے - ہماری خرچ کردہ پونجی واپس ہو گئی ہے - اب ہم اور رسد لائیں گے " یہاں مجھے یہ سوال پریشان کیے ہوئے ہے کہ گو حضرت یوسفؑ نے جان بوجھ کر بھائیوں کے علم میں لائے بغیر یہ رقم رکھوا دی تھی لیکن برادرانِ یوسفؑ کو اور حضرت یعقوبؑ کو تو علم نہ تھا کہ یہ رقم دانستہ لوٹائی گئی ہے - ایسی صورت میں دیانت و امانت کا بنیادی تقاضا تو یہ تھا کہ غلط فہمی

یا سہو سے واپس آئی ہوئی اس رقم کو امانت سمجھا جاتا۔ اور اس کے واپس کرنے کی تدبیر کی جاتی۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر بھی اس پہلو پر غور نہیں فرماتے۔ قرآن کریم یا کسی روایت میں قطعاً کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ حضرت یعقوبؑ نے اس رقم کو لوٹانے کا کوئی ارادہ کیا ہو یا خیال بھی ظاہر کیا ہو۔

۳۔ تاریخِ اسلام کا ایک بہت ہی مشہور واقعہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک یہودی نے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر اپنا تنازعہ پیش کیا۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات مقدمہ سن کر فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔ واپس آتے ہوئے اس مسلمان منافق نے معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس لے جانے کو کہا اور جب یہ دونوں حضرات حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوئے اور عمر فاروقؓ کو یہ معلوم ہوا کہ اس قضیے کا فیصلہ قبل ازیں آنحضرتؐ فرما چکے ہیں تو آپ نے اس منافق مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ اسی واقعہ کی بنا پر دربار رسالتؐ سے حضرت عمرؓ نے فاروق کا خطاب پایا۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے آخر کس اختیار کی بنا پر ایک شخص کی گردن ماری جب کہ اسلام کا ایک باقاعدہ عدالتی، شہادتی اور تعزیری نظام ہے۔

جواب:۔ آپ نے جس اہتمام سے اپنے اعتراضات اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی عمارت تعمیر کی ہے اُن کا جواب اگر تفصیل سے دینے کی کوشش کی جائے تو وہ بھی کم از کم ایک کتابچے کی شکل اختیار کر لے گا، تاہم میں مختصراً آپ کے اشکالات کا جواب عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ قرآن مجید کی آیات یا تفہیم القرآن کے حواشی میں یہ مضمون بیان نہیں ہوا کہ حضرت سلیمانؑ اپنے تمام کار ہائے نبوت اور انتظامِ ملکی کو ترک کر کے ایک قصر کی تعمیر و نگرانی میں ایسے منہمک ہو گئے کہ دوسری بے پایاں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ قرآن مجید میں صرف یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے بعض جنات کو (جو غالباً سرکش اور کافر ہوں گے) ایسا مسخر کر دیا تھا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں اور دھات کی دیگیں وغیرہ بناتے تھے۔ اس کام میں حضرت سلیمانؑ کے لیے شب و روز کسی لمبے عرصے تک ایک ہی جگہ بیٹھ کر نگہداشت کرنا ضروری نہیں تھا۔ البتہ ایسا ہونا اغلب ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی روز کسی متعین مقام پر تشریف فرما

ہو کر جنات کو مصروفِ کار دیکھ رہے ہوں گے کہ اُن کے اوپر قضائے اجل وارد ہو گئی۔ اُن کے ہاتھ میں جو عصا ہو گا وہ اگر چہ چند گھنٹے بھی غیر متحرک رہا ہو تو اُسے دیمک نے چاٹ لیا ہو گا اور یہ ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات کوئی چیز تھوڑی دیر تک زمین پر رکھی رہے تو اُسے دیمک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ مولانا مرحوم یا بعض دوسرے علماء نے اگر گھن کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد بھی دیمک ہی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ (دآبۃ الارض (زمین کا جانور) اس کے لیے واضح قرینہ ہے۔ اگر عصا کا نچلا حصہ دیمک خوردہ ہو گیا اور اُدھر ہاتھ کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی ہو گی تو عصا زمین پر آ رہا ہو گا۔ اور جسد مبارک بھی ڈھلک گیا ہو گا۔ جنات چونکہ حضرت سلیمانؑ ہی کے لیے مسخر تھے، اس لیے انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو گا۔ اور یہ سوچا ہو گا کہ اگر حضرت سلیمانؑ کی موت کا پتہ انہیں بروقت چل جاتا تو وہ اسی وقت اس مشقت سے چھوٹ جاتے۔ بہر حال اس سارے سلسلۂ واقعات کے لیے ہفتوں اور مہینوں کا وقفہ ضروری نہیں، چند ساعتوں میں یہ سب کچھ رونما ہو سکتا ہے۔

۲۔ جب مصر میں قحط پڑا تو غالب امکان اس کا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا اور فلسطین بھی قحط کی زد میں آگئے ہوں گے۔ اور سارے قحط زدہ علاقوں میں یہ خبر پھیل چکی ہو گی کہ مصر میں غلّے کے پرانے ذخائر موجود ہیں۔ اور وہاں کے حکمران نہ صرف اپنے شہریوں کو بلکہ دوسرے قحط زدہ علاقوں کے باشندوں کو بھی غلّہ تقسیم کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں تو آپ نے بہت سے اشکالات سوچ لیے ہیں لیکن یہ نہیں سوچا کہ اُن کے صاحبزادے حضرت یوسفؑ جو نبی تھے انہوں نے غلّے کی خرید و فروخت کا کوئی باقاعدہ کاروبار نہیں شروع کر رکھا ہو گا۔ بلکہ امر زیادہ قرین قیاس ہے کہ جو مستحق بھی اُن کے پاس آتا ہو گا وہ اس کی احتیاج کی تحقیق کے بعد اس کی ضرورت بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ پوری کر دیتے ہوں گے۔ اُن کے بھائی اگر کچھ تھوڑی بہت پونجی لاتے ہوں گے تو وہ بھی غالباً بطور ایک ہدیہ کے پیش کی ہو گی اور حضرت یوسفؑ نے بھی شاید پورے ناپ تول اور حساب کتاب کے ساتھ اُن سے معاملہ نہیں کیا ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ گنتی کے چند درہم یا دینار ہوں گے اور جب فلسطین پہنچ کر انہوں نے دیکھا ہو گا کہ ہماری پونجی بادشاہ نے چپکے سے ہمارے سامان میں رکھ دی ہے تو انہوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ انہوں نے قصداً ہمارے سامنے اسے ہمارے

انھیں واپس کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ ایک طرح سے تحفہ و ہدیہ کی تحقیر و توہین ہے۔ اب اس کے بعد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حضرت یعقوب فوراً انھیں کہتے کہ سینکڑوں میل اُلٹے چل کے جاؤ اور اس نقدی کو اُن تک پہنچاؤ۔ جب کہ یہ بات واضح تھی کہ حضرت یوسفؑ نے دانستہ اُسے اپنے پاس رکھنے اور اُسے واپس کرنے کے لیے ایک اسلوب اختیار کیا۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب بادشاہ نے ہمارے معاملے میں اتنے حُسنِ سلوک اور فیاضی کا ثبوت دیا ہے تو جب ہمیں دوبارہ غلّے کی ضرورت ہوگی تو پھر جائیں گے، اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے جائیں گے اور دوبارہ سارا ہدیہ پیش کر دیں گے۔ بائیبل کا بیان یونہی ہے کہ باپ بیٹے اس نقدی کو بوروں میں پاکر سہم گئے اور باپ نے کہا کہ اسے واپس لے جاؤ۔ بعض مفسرین نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ لیکن فی الواقع اگر یہی صورت ہوتی تو یہ قصّے کا ایک اہم جزو تھا، جس کا قرآن میں حذف ہونا مستبعد تھا۔ واللہ اعلم۔

۳۔ یہودی اور حضرت عمرؓ کا جو واقعہ آپ نے لکھا ہے یہ پڑھا تو میں نے بھی ہے لیکن چونکہ حوالہ آپ نے بھی نہیں دیا، اس لیے اسے تلاش کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ لیکن اس واقعہ کی ایک روایت ایسی بھی میری نظر سے گزری ہے جس میں فقط حضرت عمرؓ کا تلوار نکال لینا مذکور ہے۔ اس میں منافق کے سر قلم کر دینے کا ذکر نہیں ہے۔ اور حضرت عمرؓ چونکہ سخت گیر انسان تھے۔ لہٰذا اُن کے بارے میں تلوار نکال لینے کے اور بھی کئی واقعات مذکور ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ ایک آدمی اگر مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور اُس کے بعد اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قابلِ قبول نہ ہو تو اُس کا یہ فعل ارتداد کی تعریف میں بھی آسکتا ہے۔ اور اس لیے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اُسے مرتد اور واجب القتل سمجھ کر اس کا خاتمہ کر دیا ہو۔ مگر ہر خلیفہ کی حکم عدولی اور سرتابی پر یہ سزا نہیں دی جا سکتی۔ کسی دوسرے حاکم یا خلیفہ کے معاملے کو آنحضورؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ خلفائے راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا گیا اور اُن پر بعض لوگ سبّ و شتم تک کرتے تھے، بعض اُن کی بیعت میں متامل تھے۔ لیکن خلفائے راشدین نے انھیں واجب القتل نہیں سمجھا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر کوئی سبّ و شتم کرے یا اسلام لانے کے بعد آنحضورؐ کی اطاعت سے انکار کر دے تو صرف اُس شخص کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

(بقیہ اشارات) ہوتی ہے، مگر مہاجرین کی مشکلات وضروریات کا کوئی چرچا نہیں ہوتا۔ کاش کہ کچھ لوگ ہمت کرکے نکلیں اور موقع پر خود جاکر ان کے دردناک حالات دیکھیں اور اپنے مشاہدات کو اشاعت میں لائیں۔ ایک چھوٹی سی تصویر احوال پیش خدمت ہے جو ڈاکٹر عبدالوارث صاحب کی مشاہداتی رپورٹ سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے بلوچستان میں مہاجرین کے ایک کیمپ میں کام کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

—— دو زخمی مجاہدین کے بارے میں جو وارڈ نمبر ۱، ۲ میں داخل اور زیر علاج ہیں، بہت متفکر ہوں۔ بینوپچ نامی مجاہد (عمر ۲۲ سال) جن کی ریڑھ کی ہڈی میں سات ماہ پیشتر دشمن کی گولی پیوست ہو گئی تھی، اب تک لاعلاج پڑے ہیں ...... نچلا دھڑ بالکل بے حس ہو گیا۔ کراچی کے ماہرین سے مشورے لیے اور یہ جواب ملا کہ یہ تو لاعلاج ہے۔

—— (دوسرے ۲۳ سالہ نوجوان ہشاش بشاش مسکراتا چہرہ مگر قوت گویائی سے محروم، قندی آغا بے حس و حرکت پڑے چمکتی ہوئی آنکھیں اِدھر اُدھر گھما رہے ہیں ...... سوائے آنکھوں اور کان کے باقی سارے حواس معطل ہیں۔

—— پرسوں ہی قندھار اور گردونواح کی آبادی پر انتہائی وحشیانہ بم برسائے گئے ہیں ..... مرد سارے پہاڑوں میں تھے ...... عورتیں بھاگیں، بچوں نے گھر چھوڑے، ننگے پاؤں ننگے سر ۳۴ عورتیں، ۶۷ بچے بارڈر پار کر کے چمن پہنچ گئے۔ ۱۱۰۔ افراد کے اس گروہ میں ۱۰ سال سے کم عمر کے بچے اور عورتیں ہیں، جوان یا بوڑھا کوئی ایک مرد بھی ساتھ نہیں۔ ۱۴ عورتیں راستہ بھٹک گئیں یا دشمن کے ہاتھ آ گئی ہیں۔ (ایک شیر خوار بچہ راستے میں گر گیا)

—— صبح ۲ ستمبر ۸ بجے مہاجر کیمپ پہنچا۔ ایک نیا قبرستان بن چکا تھا۔ ۶۰، ۷۰ قبریں ہیں، تیس افراد ہیضہ سے لقمۂ اجل بن گئے ہیں ...... درجنوں مریض دیکھے۔ جوان بھی، بوڑھے بھی، عورتیں اور بچے بھی۔ اسہال ہے، قے ہے، چہرے سفید، جسم بے حس و حرکت، آنکھیں کھڑی کہیں دُور گھور رہی ہیں اور ہونٹ خشک ...... کچھ بوڑھے اپنے نیم جاں مریضوں کے سرہانے بیٹھے یٰس شریف کی تلاوت کر رہے ہیں، بچے رو رہے ہیں، بلبلا رہے ہیں، کچھ مریض، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ نزع میں ہیں۔

—— میں اور میرا کمپونڈر جھونپڑیوں اور خیموں میں ڈرپ (DRIP) لگا رہے ہیں........ رات ہو گئی، لیکن نہ تو کہیں دیا جلا نہ آگ۔ ایک مریض دیکھ کر انجکشن تیار کیا۔ لگانے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے مگر ندارد۔

—— ایک مریض کے لیے کہا: رات کو چاول کھلاؤ۔ "ڈاکٹر صاحب یہاں تو پانی میسر نہیں، بچوں کو روٹی میسر نہیں، آپ چاول کی بات کرتے ہیں، کہاں سے لائیں، کیا دے کر لائیں"۔ جواب تھا۔

میں نے تاسف سے پوچھا: کیوں آپ کو راشن نہیں ملتا؟ جواب تھا: دو ماہ پہلے ملا تھا، صرف گندم ۱۲ سیر۔

—— اور پانی کا بندوبست؟ میں نے پوچھا۔

(پانی جو دکھایا گیا اس کا حال یہ تھا)

چھوٹے سے نالے میں گدلا پانی بہہ رہا ہے۔ ترش، تلخ اور بہت تھوڑا سا۔

—— دُور سے دو گاڑیاں سی اُڑتی آ رہی تھیں۔ نزدیک آئیں، بچے، بوڑھے، عورتیں ایک دوسرے کے اُوپر نیچے۔ یہ ابھی ابھی افغانستان سے پہنچے ہیں۔ کہاں رہیں گے؟ پتہ نہیں!

کیا اس چھوٹی سی جھلک سے پاکستان کے خوشحال اصحاب کو مہاجرین کی مصیبت، اُن کے مسائل اور اُن کی ضروریات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ ہمارے یہاں کا مٹی ڈھونے والا مزدور ہو یا نرا بھکاری، اُن سے سو درجے بہتر حالات میں ہے۔

یہ لوگ جو آج مہاجرت کی مصیبت کی بھٹی میں تپ رہے ہیں، یہ بھی اپنے گھروں میں معزز اور خوددار لوگ تھے، ان کے تعلقات کے دائرے ہوں گے، اُن کے قبیلے اور خاندان باغوں اور کھیتوں اور ریوڑوں کے مالک رہے ہوں گے۔ آج ظلم کی ایک خونیں لہر نے اُنھیں اُٹھا کر ہمارے پاس لا پہنچایا ہے۔

آج اِن مظلوم اور مصیبت زدہ بھائیوں بہنوں اور اُن کے معصوم بچوں کے لیے ہمارے سینوں

ہیں حساس دھڑکتے دل اور ہماری آنکھوں میں آنسو ہونے چاہئیں۔

مجھے معلوم ہے کہ بعض خوشحال حضرات یا اُن کی فریں خاموشی سے مہاجرین کی کم یا زیادہ خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن یہ مثالیں تھوڑی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو احساس ہو جائے تو دس دس مہاجر کنبوں کے یا متعدد خیموں کی مخلوق کے پورے مصارف کی ذمہ داری سال چھ ماہ کے لئے بہ سہولت اٹھا سکتے ہیں۔ کئی اصحاب چاہیں تو تاریخ کی جھولی میں ایسی زریں مثالیں ڈال سکتے ہیں کہ وہ اپنے مال و متاع کا آدھا حصّہ مظلوم مہمانوں کے لئے الگ کر دیں۔ منظر آج یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شہری اور دیہاتی لوگ نقدی کے علاوہ غذائی سامان اور برتن، لحاف اور بستر، گرم کپڑا اور کمبل، دوا دارو اور ٹیکے، لالٹینیں اور ماچیں خرید خرید کر مہاجرین کو بھجوا رہے ہوتے۔ ہر کسی کو سردی میں ٹھٹھرنے والوں کا دکھ ہو۔ ہر کسی کو سسکتے بچوں کا احساس ہو، ہر کسی کو پریشان حال خواتین کی آزمائش کا اندازہ ہو، ہر کسی کو زخمیوں اور مریضوں سے ہمدردی ہو۔ پوری قوم افغان مہاجرین کو یہ محسوس کرا دے کہ پاکستان میں چاروں طرف ان کے کروڑوں بھائی اور خادم بستے ہیں۔

یوں ہو تو مدینہ کے انصار کی قائم کردہ مقدس روایت پھر تازہ ہو کر سامنے آسکتی ہے اور اس کی برکات مہاجرین ہی کو نہیں، خود ہمیں لوٹ کر ملیں گی۔ ہم پر جو دولت پرستی اور اسراف و تبذیر کا عذاب آیا ہوا ہے شاید یہ ٹل جائے۔

اصل میں کروڑوں انسانوں میں محض اپیلوں اور مضامین سے عمومی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ ضرورت "چند دیوانوں" کی بھی ہوتی ہے۔ جو اپنے پاس سے جو کچھ دے سکتے ہوں وہ بھی دیں، اور پھر گلی گلی، محلے محلے نکل کھڑے ہوں اور بلا امتیاز ہر دروازے کو کھٹکھٹائیں۔ نقد رقوم یا ضروری سامان و اجناس میں سے جو کچھ مل سکے اسے شہر شہر اور گاؤں گاؤں جمع کریں اور باقاعدہ رسیدیں دیں۔ اس طرح اعانتِ مہاجرین کی ایک تحریک ملک بھر میں چل پڑے گی۔

جو کچھ جمع ہو، اسے قابلِ اعتماد ادارے یا انتظام کے ذریعے مہاجرین کے کیمپوں تک پہنچایا جائے۔ ایسے بندگانِ خدا اپنے ساتھ مناسب پمفلٹ رکھ سکتے ہیں، جہادِ افغانستان کی اہمیت پر بات کر سکتے ہیں، روسی جارحیت کے موضوع پر حقائق کو واضح کر سکتے ہیں، مہاجرین کی تکالیف اور ضروریات بتا سکتے

ہیں اور سوالات اور اعتراضات کے جواب دے سکتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ کسی دروازے پر جائیں تو وہاں سے کچھ نہ ملے یا کورا جواب ملے یا اذیت ناک باتیں سننی پڑیں۔ ایسا کہیں کہیں ہو سکتا ہے مگر اکثریت ایسی ہے کہ اگر خدا ترس، قابلِ اعتماد اور دیانت دار لوگ مہم پر نکلیں تو انہیں ہزما مثبت جواب ملے گا اور اس مقصد سے اٹھایا ہوا ایک قدم اور زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ کتنے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہوگا۔ جس نے انکار، اعراض یا گالیوں پر صبر کر لیا، اس نے تو آخرت کے لئے بڑی کمائی کر لی۔

جو لوگ یہ کام کریں انہیں اس جذبے سے نکلنا چاہیئے کہ وہ خدا کی راہ میں دین کا ایک تقاضا پورا کرنے کے لئے نکل رہے ہیں۔ وہ صلہ، نمائش اور ریا سے بالاتر ہیں۔ وہ اس درجہ محتاط ہوں کہ نقود میں سے ایک پیسہ اور اجناس میں سے ایک ذرہ بھی ادھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ ساری امانت حقداروں تک پہنچے۔

یہ کام اگر یہاں ٹھیک سے کیا جائے تو اس کے ذریعے عوام میں ایک نیا ایمانی و اخلاقی احساس بیدار کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں اصلاح و تعمیر کے رجحان کو ترقی دی جا سکتی ہے اور پوری قوم خدا کی رحمتوں کی مستحق ہو سکتی ہے یا کم سے کم اس کی طرف سے کسی سخت گرفت سے بچ سکتی ہے۔

ایسا عنصر کوئی ہے تو وہ قدم آگے بڑھائے، نہیں ہے تو پھر یہ سمجھنا چاہیئے کہ بہ حیثیت ایک مسلم قوم کے ہم میں زندگی باقی نہیں ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔

۱

مسافرانِ عدم
کی

درخشاں زندگیاں ○ روشن راستے

○ اسلامی تحریکِ زندگی کی ظلمات کو روشن کرتی ہے۔
○ اسلامی تحریک کے علمبردار لوگ تاریخ کے راست رو مسافر ہوتے ہیں۔
○ ایسے مسافروں کی زندگیاں روشن ستاروں کی مانند ہوتی ہیں۔
○ بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے رہنمائی کا سامان
○ ہر زندگی، ایک پیغامِ زندگی
○ نمونے کی اِن زندگیوں میں صالح زندگی کے بے شمار نمونے
○ سُست رو مسافروں کے لیے تیز روی اور تیز گامی کا پیغام

پیغامِ زندگی کی حامل کتاب:

مُسافرانِ عدم

تحریکِ اسلامی کے مرحوم رہنماؤں کی زندگیوں کے تحریکی خاکے جن میں ان کی تحریکی زندگی کا نچوڑ آگیا ہے۔

اسعد گیلانی کے جذبہ انگیز قلم سے

صفحات ۵۰۰ ○ سائز $\frac{۲۳ \times ۳۶}{۱۶}$ ○ زیرِ طبع

چند نام درج ذیل ہیں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
مولانا مسعود عالم ندوی
چودھری علی احمد خاں
چودھری غلام محمد
مولانا جان محمد بھٹو
خان سردار علی خان
نصر اللہ خان عزیز
مولانا عبدالعزیز
خان محمد باقر خان
صدیق الحسن گیلانی
ڈاکٹر نذیر احمد شہید
الٰہ بخش شہید
حمیدہ بیگم
عبدالمالک شہید

**

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار۔ لاہور